جلوۂ صد رنگ

ڈاکٹر برج پریمی

دیپ پبلی کیشنز
"تپسیا" آزاد بستی نٹی پورہ، سری نگر (کشمیر)

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ)

اشاعت —— ۱۹۸۵

سرورق —— قیصر سرمست

خطاط —— ریشی

تعداد —— پانچ سو

طباعت —— اعلےٰ پرنٹنگ پریس، دہلی

ناشر —— دیپ پبلی کیشنز "تپسیا" آزاد بستی، نٹی پورہ سرینگر

قیمت (۳۵) پینتیس روپے

تقسیم کار

دیپ پبلی کیشنز

"تپسیا" آزاد بستی" نٹی پورہ سری نگر (کشمیر)

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ماں کے نام

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

مصنف کے بارے میں

نام : برج کشن ایمہ

قلمی نام : برج پریمی

ولادت : ۲۴ ستمبر ۱۹۳۵ء

مقام : درابی یار حبہ کدل

تعلیم : ایم اے (اردو)

بی - ایڈ

پی - ایچ - ڈی

اعزازات : آل انڈیا ہندی اردو سنگم ۱۹۷۶ء

اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۸۲ء

شغل : شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی میں درس و تدریس

پتہ : ۱۰ ٹیچرس کوارٹرس - یونیورسٹی کیمپس حضرت بل

سری نگر کشمیر (۱۹۰۰۰۶)

● "جلوۂ صد رنگ" کی اشاعت کے لئے مجھے جو مالی امداد ریاستی کلچرل اکادمی سے ملی ہے - اس کے لئے میں اکادمی کا شکر گزار ہوں۔ ——— برج پریمی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

"حقیقت تو یہ ہے کہ کشمیر حُسن وجمال کی ان تمام
جلوہ سامانیوں سے بہت بُلند اور بہت بالا ہے
جس کا میں نے کبھی تصوّر بھی کیا ہو۔"

— فرانسس برنیر
۱۶۶۵ء

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پیش گفتار

اُردو دُنیا کا کشمیر سے تعارف کچھ اتھلا اتھلا سا رہا ہے اور وہ کشمیر کو عام طور اس کے عوام اور اس کی اسطور سے الگ تھلگ کر کے دیکھتے ہیں لیکن ابتداء میں فوقؔ اور اقبالؔ کا ذکر کسی طرح ٹالا نہیں جاسکتا کہ وہ صورتِ حال کا بالکل ہی الگ رُخ پیش کرتے ہیں۔ اور اگر اُن کی تمجید میں کوئی کوتاہی کی جائے تو اس ساری منطق کی بساط ہی اُلٹ جائے گی۔ فوقؔ اور اقبالؔ دونوں کشمیری تھے اور دونوں نے اردو میں کشمیر کے داغ داغ وجود اور اس کی روح کا نوحہ چھیڑ دیا۔ ابھی وقت کا تناظر ان دونوں شخصیّات کو خالص اسطوری حیثیت بخشنے میں مانع ہے لیکن آیندہ یگوں میں یہ بات سب مانیں گے کہ کشمیر کی بیداری کی طرح اُنہوں نے ہی ڈالی اور اس کی شناخت کا سب سے بلند آہنگ ترانہ انہوں نے ہی چھیڑا لیکن یہ پس منظر اُردو کے دوسرے ادیبوں کے سرسری اور رسمی روّیئے کو اور بھی زیادہ شدید بنا دیتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اُردو ادب کشمیر کے ذکر سے خالی رہا ہے۔ ہر دور میں اُردو کے ادیب اور خاص طور شاعر اس موضوع کو بڑا مرغوب موضوع پاتے رہے ہیں لیکن وہ زیادہ تر اُنہی جذبات کی بازگشت کرتے ہیں جو اکبر بادشاہ کے درباری شاعر فیضیؔ نے ظاہر کئے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تھے اور جس میں انھوں نے یہاں تک خیال کا پیچ لڑایا تھا کہ انہیں بُھنے ہوئے مُرغ
کشمیر کی فضاؤں میں بال و پر سے دوبارہ آراستہ ہوتے ہوئے نظر آتے تھے۔ غیبی حکمران
طبقے کے ترجمان تھے اور وہ اُن انسانوں پر نظر ڈالنے سے معذور تھے جو دن رات ستم
ہائے روزگار کی جہنم آسا بھٹی میں کباب ہو رہے تھے لیکن بعد میں جب کشمیریوں کو ہوش
آیا تو اُنہوں نے اس انداز کو "لمڑ بازی" (گپ مارنے) سے تشبیہ دی۔ بہر کیف اُردو
کا ادیب یا تو اپنے احساس برتری یا اپنی تہذیبی کم مائیگی کی وجہ سے کشمیر کا کوئی بامعنی اور
بھرپور عکس نہیں اُبھار سکا وہ کشمیر کو ایک جاگیردار کے رومانی مزاج کے فرزند کی آنکھ
سے دیکھنے کا عادی رہا۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر سے متعلق اُردو کے ادیبوں کی تحریریں کشمیر
کے عرفان کو عام کرنے میں ناکام رہیں۔ ہاں عزیز احمد کے چند ناول اس سلسلے میں اپنی
خامیوں کے باوجود بس غنیمت ہیں۔ کرشن چندر اور دوسرے بڑے ادیب بھی کشمیر سے متعلق
سلمان رشدی کے انگریزی ناولوں سے مشابہ کوئی چیز پیش نہ کر سکے۔ ان حالات میں
اس خلیج کو پاٹنے کا مسئلہ واقعی سنگین نوعیت اختیار کر لیتا ہے۔ اردو کا ادیب تو کشمیر
پر اس لئے اپنا حق سمجھتا ہے کہ یہاں کی سرکاری زبان اُردو قرار دی گئی ہے۔ وہ اُردو
کے لئے اس ریاست سے ڈھیر ساری رعایتوں کا بھی طلب گار ہے لیکن اُسے اب بھی اس
ترسیل کی واپسی ہر میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اُسے نہ تو کشمیر کی روح کا جھروکہ کھول کر
اُس کے "قعر دریا نشیں" باطن سے واقف ہونے میں دلچسپی ہے اور نہ کشمیر کے
اُردو ادیب کے ساتھ برابری کی سطح پر پیش آنے کا خیال ہے۔ سچی بات تو یہ ہے
کہ چند معزز استثنات کے بغیر، جو بہر حال اس کلیے کو ہی درست ثابت کرتے ہیں، اُردو
کے ادیب کشمیر کے اُردو نگاروں کے متعلق اپنی خلوتوں میں بہت اچھی آراء کا اظہار نہیں
کرتے اور اگر کرتے ہیں تو اُس کی کیفیت بقول شاعر ایسی ہوتی ہے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اہلِ ثروت جیسے دیتے ہوں غریبوں کو زکوٰۃ

ان حالات میں اس ترسیلی خلیج کو پاٹنے کی صلیب کشمیر کے اردو ادیب کو ہی اٹھانا پڑ رہی ہے اور خوشی کا امر ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنا کام کسی رعونت کے بغیر پوری دیانت داری اور اہلیت کے ساتھ کر رہا ہے۔

برج پریمی کے اس مجموعے کو میں اس سلسلے کی ایک اہم کڑی سمجھتا ہوں۔ پریمی نے اگرچہ اردو کی کارگاہ میں اپنے اظہار کا جلوہ دیکھنے اور اپنے آپ کی تفہیم کی کاوش کی ہے لیکن اس کا بالواسطہ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ اردو دنیا کے لئے کشمیر کے چند لخت ہائے معتبر کو پیش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ابھی اردو دنیا کو سعادت حسن منٹو پر پریمی کے وقیع اور شاندار کام کی پوری آگہی نہیں ہے لیکن جوں جوں منٹو کی اسطور کی لو اونچی ہوتی جا رہی ہے اور پریمی کا تحقیقی اور تنقیدی کام عام ہوتا جا رہا ہے اُن کے کام کی قدر و قیمت بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ بات کسی شک و شبے کے بغیر کہی جا سکتی ہے کہ آئندہ منٹو کو اپنے دور کے چوکھٹے میں دیکھنے اور اُن کے ذہنی وفاداریوں کے سُوتے دریافت کرنے میں پریمی کے کام سے اغماض برتنا بہت مشکل ثابت ہو گا۔ پریمی کا زیرِ نظر مجموعہ اُسے منٹو کتھا کے دائرے سے باہر کو ایک آزاد نظر ادیب کی حیثیت سے ہمارے سامنے لا کھڑا کر دیتا ہے جس کے ذہنی اور فکری امکانات کشمیر کے ظاہر و باطن پر محیط ہیں جس کے رومانی ارتباط بڑے متنوع اور رنگا رنگ ہیں جس کے مطالعے کا عمق قابلِ تعریف ہے اور جس کے بات کہنے کا ڈھنگ دل کو بھاتا ہے۔ کشمیر شناسی کا جو پیرایہ اُس نے اختیار کیا ہے۔ وہ کشمیریوں کے بڑھتے ہوئے قومی شعور اور انفرادی اعتماد کے ساتھ ساتھ اردو قاری کے لئے کچھ انوکھے، نا آشنا مگر بے حد شاندار مناظر کی کھڑکیاں کھولتا ہے۔ وہ جب کشمیر پر کچھ پڑھنا چاہتا ہے تو عموماً

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اُسے کشمیر پر غیر ملکی مصنفین کی انگریزی کتابیں یاد آجاتی ہیں۔ نہ معلوم اُسے کیوں ان موضوعات پر لکھی گئی اردو کتابیں اب بھی ایسی لگتی ہیں جیسے بقول نیاز فتح پوری "جھوٹ بولا جارہا ہو" اُن کے نازک مزاج پر گراں نہ ہو تو انہیں یہ اطلاع دینے میں کوئی ہرج نہیں کہ اس کتاب کے بعد اب اُن کے شیلف کے لئے کشمیر کی تواریخ و ثقافت کے بارے میں ایک قابل اعتبار و استناد کتاب آگئی ہے۔ ہیرج پرہمی نے اس کتاب میں کشمیر کی تواریخ و تمدن کے وسیع گوشوں کو کھلی ہوئی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ یہ درست ہے کہ ان میں سے "تقریباً" ہر ایک موضوع پر ایک الگ تصنیف پیش کی جاسکتی ہے لیکن ایک عام قاری کے لئے اس طشتری میں جو خوان نعمت چنا گیا ہے وہ کشمیر سے متعلق اُس کی بڑی حد تک تشفی کرے گا اور اُسے کشمیر سے متعلق بعض "بھڑ کے چھتوں" پر تحقیق کے پتھر مارے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ پرہمی کے طبعی انکسار کی فتح ہے کہ وہ یہ سب کچھ ایسے برجستہ انداز میں کہتا ہے "جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات"۔ کشمیر کی اسطور اور تاریخ میں اتنی گہرائی ہے کہ اس کے صدف توڑنے میں ابھی نہ معلوم کتنے غوطہ خوروں کی ضرورت پڑے گی اور پھر بھی سچائی کا گوہر آنکھ مچولیاں کرتا رہیگا۔ نظر کے اس گرداب نے تعصب اور تکلف کی کتنی ہی تعبیریں جنم دی ہیں۔ مثلاً سرینگر کے نام میں اس کے پہلے لفظ "سری" کا یار لوگوں نے فیتہ لگا دیا ہے اور اس کے ڈانڈے سورج دیوتا سے ملا کر سرینگر کو سورج کا شہر' قرار دیا گیا ہے۔ یہ جاذب نظر فریب جوزف سٹائین جیسے اہل فن آرکیٹکٹ پر بھی چلا ہے جن کا ڈیزائن کیا ہوا۔ سرینگر کا کنونشن کمپلیکس ابھی ابھی کھول دیا گیا ہے اس کمپلیکس کا مرکزی نقطۂ سورج کا وہ خاکہ ہے جو اسے سرینگر کے مفروضہ نام سے ملاتا ہے۔ سنگ مرمر سے بنایا ہوا یہ سورج اچھی تعمیر کاری ہے لیکن اپنی تواریخی روایت میں ایک بے حقیقت اطلاع ہے اور پرہمی نے یہی بات کہی ہے۔ دراصل کشمیر کا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سب سے بڑا شہر سرینگر تھا۔ اتنا بڑا کہ کشمیر اسی میں ثقافتی طور سما گیا تھا۔ چنانچہ مغل دور میں سرینگر کو ہی کشمیر کہا جاتا تھا۔ سرینگر کا مطلب تھا "THE CITY" یا مقدس شہر۔ جس طرح عرب میں مدینے کو المدینہ کہا جاتا ہے۔ اگر پریمی کے اس اظہار حق سے شائین اور اسکو گمراہ کرنے والے دوستوں کی غلط فہمی دور ہو تو اس سے بڑی کامرانی کیا ہوگی۔ پریمی کا بے تعصب اور وسیع نقطۂ نظر اس کتاب کے ہر ورق پر آشکارا ہے۔ کشمیر کی تواریخ کی بھول بھلیوں میں بڑے بڑوں کے راستے گم ہوئے ہیں۔ لیکن پریمی نے بڑی احتیاط سے ان خندقوں کو پار کیا ہے۔ وہ شنکر آچاریہ کی پہاڑی کو اس نام کے علاوہ تخت سلیمان کے نام سے بھی یاد کرتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ دونوں نام اس کے اصل نام کو محو کر کے اختیار کئے گئے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ اگرچہ پریمی نے بڑے بڑے حواشی یا کتاب نامے درج نہیں کئے لیکن یہ کتاب کشمیر کی تواریخ و اسطور کے متعلق بہت ہی کار آمد معلومات بہم پہونچاتی ہے۔ میں قدرے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کتاب کی ورق گردانی اُن دوستوں کے لئے ایک مُفید مشغلہ ثابت ہوگی جو اپنے آپ کو کشمیریات کے "پہونچے ہوئے" شاستری سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں وتستا کے اصل منبع لل دید کے حالات۔ قدیم کشمیر کا لباس اور رہن سہن سے متعلق مباحث انتہائی معلومات افزا ہیں اس کتاب کے توسط سے میں ایک زخم جگر کا خاص طور ذکر کرنا چاہوں گا۔ اس میں کشمیر کی آبادی گذرگاہوں کا تو بڑا تفصیلی ذکر ہوا ہے۔ لیکن نالہ مار تک آتے آتے فاضل مصنف کا قلم کچھ تھک سا گیا ہے۔ مار کشمیر کی اسطور اور جمالیات سے وابستہ استعارہ ہے اور یہ شالا مار کے علاوہ نالۂ مار میں بھی موجود ہے۔ اس نالے کے ساتھ نہ معلوم کتنے خواب پرستوں اور زین العابدین جیسے جہاں پناہوں کے عمل کے دھاگے گندھے ہوئے تھے۔ یہ ہمارے شہر کو ایک پُر اسرار اور رومان افزاء کردار عطا کرتا تھا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ایک انوکھا کردار، جیسا دینس کو یورپ میں حاصل ہے۔ لیکن اس امانت کو چند بے خیال اور ناکافی بصیرت و بصارت رکھنے والے لوگوں نے بے دردی سے مٹادیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نالے کو دیرینہ روزی کا روگ لگا تھا لیکن روگ کا علاج کرنے کے لئے جسم کے انگ کو ہی کاٹنا نہ دانش مندی ہے اور نہ ادائیگی فرض اُس قسم کے کتنے ہی روگ خود کشمیری قوم کے وجود کو روحانی نالہ مار بنا چکے ہیں لیکن اس کے لئے کشمیری قوم کی اطلاع ضروری ہے نہ کہ اُس کا قتل۔ بہر کیف پریمی جیسے ادیبوں جو نالہ مار کے وجود کے آخری شاہد ہیں، کے حوالے سے ہمیں یہ شعر یاد آتا رہے گا :-

گفتم اے دولتِ جم ' جام جہاں بیت کو

گفت افسوس کہ آں دولتِ بیدار بہ خفت

میں پریمی کو اُس روّیئے کے لئے بھی بے حد قابل ستائش مانتا ہوں جو اُس نے محمد الدین فوق کے متعلق اپنایا ہے۔ فوق نے کشمیر کی بیداری کے لئے اپنی عصری مجبوریوں کے چوکھٹے میں رہتے ہوئے جو جدوجہد کی، وہ ہمارے کسی بڑے سے بڑے دانشور یا سیاسی کارکن نے نہیں کی۔ اُس نے کئی کنواری زمینوں میں تحقیق و جانکاری کے پہلے ہل چلائے لیکن اُس کے حاسدوں نے ہمیشہ ذاتی اور سیاسی وجوہات کی بناء پر اُس کی کردار کشی کی مہم کبھی کھُلے بندوں اور کبھی کھسر پھسر کے انداز میں چلائی لیکن یہ ہمارے نئے روّیے کی غمازی کرتا ہے۔ جب پریمی لکھتے ہیں :-

" فوق اپنے عہد کے سب سے قد آور ادیب ہیں "

اُمید ہے کہ یہ نیا انداز نظر ہمیں چھوٹی مصلحتوں کی سطح سے اُٹھ کر اپنے مشاہیر اور معاصرین کی زیادہ حقیقت پسند تعین قدر پر آمادہ کر سکے گا۔

یہ نہیں ہے کہ اس کتاب میں پریمی کی پیش کردہ ہر رائے سے اتفاق کیا جا سکتا ہے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پریمی کی عالی ظرفی بعض اوقات معروضی حقایق سے پوری طرح نہیں نبٹتی۔ اس سلسلے میں ملک راج صراف کے "رنبیر" سے متعلق اُس کی رائے کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ "رنبیر" بنیادی طور پر مہاراجوں کا گزٹ تھا اور اُن کی وفاداری کی مہر اپنے ماتھے پر سجائے ہوئے اتراتا پھرتا تھا۔ اس کی ادبی اور صحافتی حیثیت اوّل سے آخر تک مشکوک رہی اور اگر کسی کو اس میں کلام ہو تو وہ جموں یونی ورسٹی میں اس کے پرانے فائل دیکھ کر کر سکتا ہے۔ جہاں سالگرام کول اور محمدّ الدین فوق مہاراجوں سے اخبار حاصل کرنے کی اجازت حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ وہاں ملک راج صراف نے اپنی سرکار نوازی سے یہ معرکہ جیت لیا۔ اور بعد میں اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ مہاراجوں کی نظر کس قدر قیافہ شناس تھی۔ "رنبیر" کو تواریخی اولیت کے لحاظ سے مقام تو حاصل ہے۔ لیکن کیفیاتی طور پر ایک پن چکی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جو صرف گندم ڈالنے والی ڈالی کے ارد گرد طواف کرتا ہے۔ پریمی نے کشمیر میں نثر نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عبداللہ وکیل اور پریم بزاز کا "رنبیر" سے رشتہ جوڑ دیا ہے۔ جو ثبوت کا محتاج ہے۔ سچی بات ہے کہ اس سے زیادہ کشمیر اردو نثر و نظم کا شوق اُجاگر کرنے میں اس سے بیس سال پہلے شایع ہونے والے لاہور کے ہفتہ وار "اخبار کشمیری" نے ادا کیا۔ ایسا کہنا اس لئے ضروری ہے کہ سونے اور پیتل کو ایک پلڑے میں نہ تولا جاتا رہے اور تاجرانہ منصوبہ بندی سے سینچے اور الفاصوں سے پالے ہوئے مفروضوں کی اصل صورت واضح ہو۔ اس کتاب کا ایک نہایت اہم مضمون رام چندر بالی اور آرل سٹائین کے خطوط سے متعلق ہے۔ یہ اس عظیم خاور شناس اور کشمیر نواز کی زندگی کا ایک نرالا زاویہ نگاہوں کے سامنے لاتا ہے۔ اُس کی شاندار علمی اور تحقیقی مہمات سے ہم سب واقف ہیں۔ اپنی علمی پرواز میں کبھی کبھی اُس کی رفتار اتنی تیز اور اونچی ہو جاتی ہے کہ اُس کی انسانی حیثیت کے بارے میں سوچنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ رام چندر بالی کے نام

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

خطوط میں وہ ایک دلنواز اور دردمند انسان کی حیثیت سے نظر آتا ہے اور یہ اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ کشمیر سے اُس کی وابستگی کتنی گہری تھی۔ افسوس ہے کہ حالات نے کشمیر میں دفن ہونے کی اُس کی خواہش پوری نہیں ہونے دی لیکن اس ناتمام آرزوں نے کشمیریوں پر اُس کا ایک قرض چھوڑا ہے جو آج چالیس سال بعد بھی واجب الادا ہے۔ سٹائین کے نام پر قدیم کشمیر کے مطالعات کا ایک انسٹی ٹیوٹ قائم کرنا اس کا منطقی جواب ہے۔ حیرت ہے کہ کسی کو آج تک کشمیر میں سٹائین کے تعلق ایک سلیقے کا سیمینار منعقد کرنے کی بھی نہیں سوجھی۔

میں پھر پریمی کی اس کتاب کی کشمیریات سے متعلق عام قاری کے لئے اہمیت پر زور دینا چاہتا ہوں۔ مجھے فوق کے بعد اردو میں اس قسم کی ایک کتاب کا علم ہے اور وہ ہے مظفر آباد کے ڈاکٹر صابر آفاقی کی تصنیف 'جلوہ کشمیر'۔ پریمی کا طرز بیان دل کش ہے اور اُس نے کشمیر کی تواریخ کے ہزارہا صفحات کو چھان کر چند کیپسول (CAPSUL) قسم کی معلومات اس طرح ابھاری ہیں کہ کشمیر اور اس کے لوگوں کے تواریخی اور تمدنی سفر کے نت نئے گوشے روشن ہو جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب اپنی مقبولیت سے اپنا جواز ثابت کرے گی۔

سری نگر ۱۲ر اپریل ۱۹۸۴ء — محمد یوسف ٹینگ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

میری بات

یہاں میں رہتا ہوں

● جہاں میں رہتا ہوں اُسے صدیوں سے دھرتی کا سورگ کہا جاتا ہے۔ اپسراؤں کا یہ دیس تہذیب کی صُبح سے اپنے ملکوتی حُسن، اپنے رنگ اور اپنے نور سے سورگ کے انسانی تصور کا پیکر ہے یہ وہ خطۂ ارضی ہے جہاں کے صد رنگ جلوؤں نے صدیوں سے سیلانیوں کو برمایا ہے یہاں گیان و عرفان کے کتنے سوتے پھوٹے ہیں، آگہی و بصیرت کے کتنے چراغ روشن ہوئے ہیں اور عقل و عشق کے کتنے مرحلے انجام کو پہنچے ہیں۔

— تاریخ کے اوراق پر یہ سب داستانیں منقش ہیں۔

● جہاں میں رہتا ہوں، وہاں کی صُبحوں اور شاموں پہ بنارس کی صبحیں اور اودھ کی شامیں قربان ہیں۔ یہاں کی ہر سحر یہاں کی سحر ہے اور یہاں کی ہر شام یہاں کی شام ہے ان صُبحوں اور شاموں کی ہر شبیہ اور ہر رنگ بے مثال ہے۔ اس کی ہمسری کا یارا کسی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اور شبیہ یا کسی اور رنگ میں نہیں ۔ یہ سرزمین شاعر کا تخیل ہے اور مغنی کا ساز، یہ حُسن پرستوں کی عبادت گاہ ہے اور عقل و جذبے کی آماجگاہ ۔ یہاں قدرت اپنی تمام حشر سامانی بے نقاب کرتی ہے اور انسانی عقل جودتِ ذہن کے جلوے بکھیرتی ہے ۔ ستی سر کے نیلے پانیوں کے "جلاں" سے لے کر آج تک اس سورگ بھومی کے پپوٹوں پر کتنے خواب بیدار ہوئے ہیں ۔ یہاں بودھوں نے ازلی حُسن کی تلاش کی ۔ ہندو شو کو کھوجتے رہے، مسلمان توحید کے یقین سے دلوں کو روشن کرتے رہے اور عیسائی انجیل کی مُقدس آیات سے اپنے باطن کے چراغ جلاتے رہے ۔ یہاں کتنی قومیں آئیں اور نیست و نابود ہو گئیں ۔ یہ سارے نقوش ہماری میراث ہیں ۔

● جہاں میں رہتا ہوں وہ وِتستا کا شہر ہے ۔ جو پاروتی کا دوسرا پیکر ہے جسے شو نے پاتال کی گہرائیوں سے باہر کھنگھال لیا تھا کہ پاپیوں کے پاپ دُھل جائیں ۔

یہ کشپ رشی کی تپسیا ہے ۔ یہ لل دید اور شیخ العالم کا عرفان ہے ۔ یہاں حبّہ خاتون، رسول میر، پرمانند اور مہجور کے نغمے گونجتے ہیں جن میں چنار کے شیتل سایوں کی سانسیں مہکتی ہیں اور حُسن و عشق کی تمام صباحتیں اور تمام رعنائیاں رسمساتی ہیں یہ ان عطر بیز ہواؤں کا مسکن ہے جو وُلر، مانسبل اور کونسرناگ کے پانیوں سے سرسراتی ہوئی اٹھتی ہیں ۔ یہ گلمرگ، توسہ میدان اور سوہندمرگ کی خواب آگیں خوشبوؤں کی سرزمین ہے ۔ یہاں کی فضاؤں میں امرناتھ کا تقدس اور حضرت بل کا نور ہے ۔ یہ گوپادری اور تخت سلیمان، ہاری پربت اور کوہ ماراں نی نقاد، شاہ ہمدان اور کاشی شہی کا مسکن ہے ۔ یہ ناگ ارجن بھاسکر آچاریہ، ابھنو گپت اور شیخ یعقوب صرفی کی آماجگاہ ہے ۔

یہ برنیر، رچرڈ ٹمپل، رابرٹ تھارپ، لارنس، شائین، بسکو اور ایسے ہی کتنے عاشقوں کا محبوب ہے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

یہ جواہر لال اقبال چکبست اور سعادت حسن منٹو کا عشق ہے۔ یہ فن کاروں، شاعروں، عابدوں، پرہیزگاروں اور حسین دل و دماغ رکھنے والوں کا وطن ہے۔ یہ جموں اور لداخ کا دل ہے اور بھارت ماتا کے ماتھے کی بندیا۔

● یہ سرزمین صدیوں کی غلام در غلام، استحصال کی چکی میں پسی ہوئی ہے بسی کی نیندوں میں اونگھتی ہوئی رہی ہے۔ یہاں کے حسن کو بوالہوسوں کی بھٹیوں میں محاصر کیا گیا ہے قدرت کے خزانے سے عطا ہوئی دولت کو جاگیردارانہ نظام کے ہر دور میں بھر بھر کر لوٹا گیا۔ یہاں کے ذہن رسا عقل و دل گیان و عرفان، علم و فن کو غلامی کی شمشیر نے ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ نسل در نسل غلامی کے حصار نے ذہنوں کو مفلس اور روح کو مقید کر کے بے بس اور لاچار بنا دیا۔ یہاں کی معصوم اور بے ریا مہمان نوازیوں نے جاگیردارانہ اور چیک دارانہ نظام کے زور و زد کو سہہ لیا۔ یہ ماضی کے گھاؤ ہیں جو برس ہا برس تک رستے رہے ہیں جن کی یادیں اب بھی کبھی کبھی دل کے دریچوں میں لرزش پیدا کرتی ہیں اور کبھی کبھی نگاہیں بند ہو جاتی ہیں۔ لیکن بیداری اور آزادی کی چنگاری ہر عہد میں دہکتی رہی ہے۔ اسی دہکتی ہوئی جوالا نے شیر کشمیر کو پیدا کیا۔

● میں صدیوں سے اس سرزمین میں رہتا چلا آیا ہوں۔ میں اس کا انگ انگ اور رُوم رُوم ہوں۔ میری رگ رگ میں یہی عطر بیز ہوائیں، یہی تقدس و طہارت قدرت کی مہانتا کے یہی رنگ، کیسر کی کیاریوں کا یہی سہاگ، علم و فن اور عقل و دل کی یہی خوشبو ہے۔ مجھے ازل سے ان پُراسرار سناٹوں کو سمجھنے کی تلاش ہے جو یہاں کے ہر پربت، ہر جنگل اور جھیل ہر پھول اور آکاش پر آہستہ خرامی سے اڑتے ہوئے ہر بادل میں محسوس ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے اس مجموعے میں شامل اپنی الٹی سیدھی تحریروں میں ان حشر ساماں یوں کو تھامنے کی کوشش کی ہے۔ ان حشر ساماں سناٹوں کے اس قدر رنگ ہیں کہ مجھے کر الفاظ میں یارا نہیں کہ ان سبھی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

رنگوں کو سمیٹ سکوں۔ یہ ایک چھلاوے کی طرح اڑ اڑ کر فضاؤں میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور میں حیران اور مبہوت خلاؤں کی پہنائیوں میں صرف تکتے رہ جاتا ہوں

یہ رنگ میرے وجود کا حصّہ ہیں!
یہ میں ہوں، میرا ریزہ ریزہ وجود!
اگر آپ کو ان رنگوں میں کہیں، کسی جگہ میرا لرزتا ہوا وجود ملے تو میں سمجھوں گا کہ میں اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب ہوا ہوں۔

یہی میرا انعام ہے یہی میرا صلہ!

● یہ مضامین اس طویل سلسلے کی ایک کڑی ہے جس پر میں کچھ عرصہ سے کام کر رہا ہوں۔ میری تمنا ہے کہ میں آئندہ بھی اس سلسلے کے مضامین شائع کروں جن میں جموں و کشمیر کے ادب، یہاں کی ثقافت، یہاں کے عرفان اور یہاں کی زندگی کے نمایاں پہلوؤں کو پیش کروں۔ میں اپنے قارئین کے زرین مشوروں کا منتظر رہوں گا۔

۱۰۔ ٹیچرس کوارٹرس
یونیورسٹی کیمپس
امر سنگھ باغ حضرت بل
سرینگر کشمیر

برج پریمی
۵ اگست ۱۹۸۴ء

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کشمیر غیر ملکی سیّاحوں کی نظر

حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سلطنت (کشمیر) حسن و جمال کی ان تمام
جلوہ سامانیوں سے بہت بلند اور بہت بالا ہے جس کا
میں نے کبھی تصور (و) بھی کیا ہو"
(فرانسس برنیر ۱۶۶۵ء)

کشمیر کے حسن و جمال کے جلوۂ صد رنگ کی حشر سامانی تہذیب اور شعور کی
صبح سے مشک عنبر بیں کی طرح مہکتی رہی ہے۔ اس حسن کی خوشبو نے زمانہ قدیم سے
سیلانیوں کو برمایا ہے اور رسل و رسائل کے محدود وسائل کے باوجود یہاں
آ کر گھومنے اور یہاں کے نظر نواز جلووں میں جذب ہونے پر اکسایا۔ ان سیلانیوں
کے ذوق و تجسس کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ ہماری قدیم داستانوں کے
باہمت اور اولو العزم اور مشکل پسند کرداروں سے کم نہیں تھے جن کا مقابلہ اگرچہ
جنوں، پریوں اور عجیب الخلوق خلقت سے نہیں تھا لیکن جن کی مہمات کوہ قاف
کے جان لیوا سفر سے کم نہیں تھیں۔ ان سیلانیوں کو بھی عجیب و غریب جنگلوں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کے سناٹوں میں سے گزرتے ہوئے کسی ہفت خواں طے کرنا پڑے برفانی پربتوں کی دشوار گذار چوٹیوں، میلوں تک پھیلی ہوئی سرسبز مرگوں، تند اور تیز برفانی ہواؤں کی آندھیوں اور بے نام نقرئی نغموں کی سرسراہٹوں کے تعاقب کی سہما دینے والی کیفیات کا سامنا کرنا پڑا۔ جب آدمی پر میٹھی نیند کا جال تن جاتا ہے آنکھوں کے پپوٹوں پر رقص کرتی ہوئی یہ نیندیں بارہا ان کو موت کی دہلیز پر گھسیٹتی ہوئی لے گئی ہیں لیکن پھر۔ انہوں نے موت کی اس چال کو سمجھ کر اسے ٹال دیا ہے انہوں نے کھلی آنکھوں سے قدرت کے ان بکھرے ہوئے جلووں کو دیکھا جو غم اور ملال کے زہر پر تریاق رکھ دیتا ہے۔ انہوں نے اس خوبصورتی کے سائے میں پلنے والی نحوست اور بدصورتی کا بھی نظارہ کیا جو انسانی ہاتھوں نے پیدا کیا ہے۔ ان خوشبوؤں کے ساتھ اس بدبو کو بھی سونگھا جس نے یہاں صدیوں کی غلام در غلام زندگی کو اپنی لپیٹ میں لیا تھا اور اس کے ماتھے پر بدبختی کی افشاں ڈال دی تھی لیکن روح کے دریچوں پر دستک دینے کی ہمت سبھوں میں کہاں ہوتی ہے؟ قدرت کے جلووں کی حشر سامانی کا نظارہ کرنے کیلئے چشم بینا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے بعض اوقات جلوے سامنے ہوتے ہوئے بھی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں لیکن ــــ

......لیکن جب بادل بکھر گئے ہوں، نکھار ہٹ گیا ہو اور
کشمیر کی حقیقی بہار یا خزاں نے اپنے اسرار کھول دئے ہوں
تب ایک سخت سے سخت جان سیاح کا دل بھی پگھل جاتا ہے
اور وہ برنیر بن جاتا ہے۔[۱]

---

[۱] FRANTIS YOUNG HUSBAND KASHMIR PAGE 2

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

غیر ممالک سے اس وادی رنگ و بو میں باہر کے سیلانیوں کی آمد کا سلسلہ زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ اہم سیاحوں میں ہیون سانگ کا نام سر فہرست ہے جو ساتویں صدی عیسوی (۶۳۱ء) میں وادی میں داخل ہوا۔ دوسرا چینی سیاح اوکانگ تھا جو ۷۵۹ء میں کشمیر آیا اور چار سال یہاں مقیم رہا۔ عیسائی مبلغ فادر جیروم زیویر، بنونیٹ ڈی گیسوس اور فرانسس زیویر ابتدائی یورپی سیاح تھے۔ جنہوں نے ۱۵۷۲ء کے قریب کشمیر کی سیاحت کی۔ یہ مشنری اکبر اعظم کے ساتھ کشمیر آئے۔ فرانسیسی معالج فرانسس برنیر اورنگ زیب کے عہد حکومت میں شہنشاہ کے ساتھ ۱۶۶۵ء میں کشمیر آیا۔ بنگالی فوج کا اعلیٰ افسر جارج فارسٹر سینٹ پیٹرس برگ (روس) واپس لوٹتے ہوئے ۱۷۸۳ء میں وادی میں داخل ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ویٹرنری سرجن ولیم مورکرافٹ ۱۸۱۹ء کے آس پاس میں اپنے طویل دورے پہ روانہ ہوا تو اس نے بھی کشمیر میں قیام کیا۔ اسی طرح انیسویں صدی کے دوران مختلف وقفوں کے بعد بیرن، چارلس ہیوگل، سر رچرڈ ٹیمپل، والٹر لارنس، الگزانڈر کننگھم، نیگ، ہسبنڈ، بوہلر، ارل سٹین اور ایسے ہی کتنے مورخ، جغرافیہ دان، فوجی افسر، عالم، زبان دان اور سب سے بڑھ کر سیلانی اس خاکہ دامن گیر کے حسن و جمال کی شادابیوں سے محظوظ ہونے کیلئے چلے آئے اور اپنے اپنے تاثرات کو سفرناموں، ڈائیریوں اور کتابوں کی صورت میں ڈھال دیا۔ سال ہا سال کے کینواس پر پھیلی ہوئی اس روداد کو سمیٹنے کا یہاں محل نہیں۔ ہم صرف چند سیاحوں کے تاثرات میں سے چند اقتباسات پیش کریں گے جو نہ صرف انکے ذوق نظر پر دال ہیں بلکہ یہاں کی زندگی کے بعض اہم گوشوں کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔

ہیون سانگ

عظیم چینی سیاح اور بودھ عالم ۶۰۳ء میں چین کے ہونان صوبے میں جنم لیا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کے مقام پر پیدا ہوا بیس سال کی عمر میں اسے ایک بودھ بھکشو کا منصب عطا ہوا
بودھ تعلیمات سے پوری جانکاری حاصل کرنے کی تمنا نے اسے چانگان پہنچادیا۔ یہاں
پہلی بار اسے ناہیان اور چی یان کی یادداشتوں کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔ یہیں اس نے فیصلہ
کیا کہ اپنے ذہن میں اٹھے ہوئے پیچ در پیچ سوالات کی گتھیوں کو سلجھانے کیلئے وہ مغربی
علاقوں کی سیاحت اختیار کرے۔ ہیون سانگ پورے سولہ سال ۶۲۹ء سے
۶۴۵ء تک اپنے ملک سے باہر رہا۔ اس دوران اس نے دوسرے ممالک کے علاوہ
ہندوستان کی سیاحت کی۔ ہیون سانگ ۶۳۱ء میں مغرب کے راستے ادسکر سے
کشمیر میں داخل ہوا۔ اور یہاں دو سال قیام کے بعد ۶۳۳ء میں توسہ میدان کے
راستے واپس لوٹا۔ ہندوستان اور کشمیر کے قیام کے دوران وہ سنسکرت اور بودھ
دھرم کی کتابیں تلاش کرتا رہا۔ وہ نہایت ہی صحت کے ساتھ ان راستوں اور گذرگاہوں
کو بیان کرتا ہے، جہاں سے وہ گذرا تھا۔ اس نے بودھ وہاروں اور بودھ ستوپا کا بھی
ذکر کیا ہے اور راجا اور رعایا کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔

ہیون سانگ نے کشمیر کی جغرافیائی حدود کا ذکر کیا ہے۔ مروجہ روایات کو
تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور وادی کے آغاز کے بارے میں بھی معلومات درج
کی ہیں۔ ہیون سانگ دو سال کشمیر میں رہا وہ جنیندر وہار نام کی بودھ خانقاہ
میں قیام پذیر رہا۔ یہ خانقاہ پرورسین دوم کے ماموں جنیندر نے تعمیر کروائی تھی۔
اور موجودہ سرینگر میں واقع تھی۔ ہیون سانگ نے اپنے سفر کا مفصل حال اپنی کتاب
SI-YU-KI میں درج کیا ہے۔ وہ اپنی یادداشتوں میں کشمیر کو کشمیلو

ALEANDER CUNNING HAM THE ANCIENT GEOGRAPHY OF KASHMIR P-82 ۱ سو

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

(KI-A SHI-MI-LO) بیان کرتا ہے۔ کشمیر کا ذکر ہیون سانگ یوں کرتا ہے:-

ا۔ کشمیر کی سلطنت اپنے حدود (حلقے) میں سات ہزار لی ہے یہ ملک چاروں طرف پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہ پہاڑ بلند و بالا ہیں۔ اگرچہ پہاڑوں میں درے موجود ہیں لیکن یہ نہایت تنگ و تاریک ہیں۔ پڑوسی ممالک جنہوں نے اس ملک کو اکثر و بیشتر اپنی یلغار کا نشانہ بنایا ہے اسے کبھی پامال کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے ہیں۔ ملک کی راجدھانی مغربی اطراف میں ہے۔ اس کی حدود پر ایک بڑا دریا بہتا ہے یہ راجدھانی شمال سے جنوب کی طرف ۱۲ یا ۱۳ لی اور مشرق سے مغرب کی طرف ۴ یا ۵ لی پھیلی ہے۔ یہاں کی سرزمین بادام اور دوسرے پھل پھول اگانے کے لئے زرخیز ہے۔ یہاں اثرو ہے گھوڑے اور خوشبودار ہلدی کے پودے ہیں جن کو فوجیوں FO-CHI کہتے ہیں اس کے علاوہ دوسرے ادویاتی پودے بھی اگتے ہیں۔ [۱]

۲۔ ہوا سرد اور خنک ہے کافی برف باری ہوتی ہے مگر ہوائیں کم چلتی ہیں۔ لوگ چمڑے کی صدری پہنتے ہیں

۱۔ SI-YU-KI-BY HIUN TSIONG-TRANSLA TED-BY-SAMUEL-BEAL P-148

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اور سفید لینن کے ملبوسات استعمال کرتے ہیں۔لوگ
غیر سنجیدہ ، کمزور اور ڈرپوک ہیں۔
چونکہ یہ ملک اژدھے (دیومالائی) کے باعث محفوظ ہے
اس لئے اسے پڑوسی ممالک کے لوگوں پر برتری حاصل
ہے لوگ خوبرو لیکن ریاکار ہیں وہ علم وفضل سے آراستہ ہیں
یہاں ملحد بھی رہتے ہیں اور خدا پرست بھی۔یہاں کئی سنگھارام
اور پانچ ہزار بھکشو ہیں۔اشوک نے چار ستوپا بھی تعمیر کروائے
ہیں.....،،[۱]

فرانسس برنیر

فرانسس برنیر ایک فرانسیسی معالج تھا۔وہ اورنگ زیب کے عہد میں
ہندوستان آیا اور شہنشاہ اورنگزیب کے شاہی قافلے کے ساتھ ۱۶۶۵ء میں کشمیر میں داخل
ہوا۔برنیر نے مغل عہد کے کشمیر کے حالات اپنے مشہور خطوط میں قلمبند کئے ہیں۔
وہ پوری تفصیل کے ساتھ دہلی سے کشمیر آنے جانے والے راستوں اور گذرگاہوں
کو بیان کرتا ہے۔اس نے اس عہد کے کشمیر کی اقتصادی اور سماجی زندگی پر سیر
حاصل تبصرہ کیا ہے اور بڑے خلوص کیساتھ اپنے ان جذبات کا اظہار کیا ہے
جو کشمیر کے حسن کو دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوئے تھے۔اس نے کہا تھا:
،،حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سلطنت حسن وجمال کی

---

[1] SI-YU-KI- BY HIUN TSIANJ. TRANSLATED BY SAMUEL BEAL PAGE 148

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ان تمام جلوہ سامانیوں سے بہت بلند اور بہت بالا ہے
جس کا میں نے کبھی تصور بھی کیا ہو۔"

کشمیر کے حُسن لازوال کی سحر سامانیوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ شاعر بنتا ہے
لیکن جب یہاں کے ذہن، یہاں کی ہُنرمندی اور صناعی کا ذکر آتا ہے تو اس
کی باریکیوں کو بیان کرتا ہے اور فن کاروں کو داد دیتا ہے جو اپنی روح کا درد
اور آنکھوں کی بینائی ان شاہکاروں میں ڈھالتے ہیں اور اپنے بال بچوں کا پیٹ
بھرتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

" کشمیری اپنی ذکاوت کے لیے مشہور ہیں۔ یہ لوگ
ہندوستان کے لوگوں سے زیادہ ذہین سمجھے جاتے
ہیں۔ شعر و شاعری اور سائنسی علوم میں یہ ایرانیوں
سے کچھ کم نہیں ہیں۔ یہ بڑے ہوشیار اور محنتی لوگ
ہیں۔ ان کی کاریگری کا احساس ان پالکیوں، پلنگوں
قلمدانوں، صندوقوں، چمچوں اور دوسری ایسی چیزوں
سے ہوتا ہے جو یہ لوگ اپنے ہاتھ سے بناتے ہیں
یہ بڑی شاندار چیزیں ہیں اور ہندوستان کے طول
و عرض میں ان کا استعمال ہوتا ہے۔ لیکن جس چیز
سے ان ملکوں کی تجارت بڑھ جاتی ہے اور جس سے
وہ مالا مال ہوتے ہیں وہ ایسے گراں قدر شال ہیں جو وہ
اپنے ہاتھ سے بناتے ہیں۔ اور اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں
کا پیٹ بھرتے ہیں۔" ۱؎

۱؎ P.N.K. BAMZAI: A HISTORY OF KASHMIR

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ولیم مورکرافٹ

مورکرافٹ لنکا شائیر کا رہنے والا تھا۔ لورپول میں سرجری کی تعلیم پائی۔ اس کے بعد لندن میں مستقل طور اقامت پذیر ہوا۔ اور ویٹرنری سرجری کو اپنا پیشہ بنایا ۱۸۰۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کے سلسلے میں انگلستان سے ہندوستان کا سفر اختیار کیا۔ بنگال میں فوج کے اصطبل کے سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ کمپنی کے گھوڑوں کی حالت غیر تسلی بخش پاکر گھوڑوں کی نسل کو بہتر بنانے کے لئے مورکرافٹ نے یہ تجویز کیا کہ ترکستانی یا انگریزی گھوڑوں کو عربی گھوڑوں پر ترجیح دی جائے۔ ابتداء میں اس کی تجویز قبول کی گئی۔ لیکن بعد میں بلخ اور بخارا کے گھوڑوں پر قرعۂ فال پڑا۔ یہی سبب مورکرافٹ کی لمبی سیاحت کا محرک ثابت ہوا۔ مورکرافٹ نے اپنی سیاحت کا آغاز ۱۸۱۹ء کے اواخر میں کیا۔ وہ کئی ہمالیائی خطوں میں گھوما اور بڑے خلوص اور ایمانداری سے اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ ایسے ہی ایک سفر میں وہ شدید بخار میں مبتلا ہوا۔ جو اس کی موت کا سبب بن گیا۔

اپنی اس سیاحت کے دوران مورکرافٹ کشمیر بھی پہنچا اور یہاں قیام کیا یہ کشمیر میں سکھ دور تھا۔ مورکرافٹ نے دو جلدوں میں ایک مفصل سفرنامہ تحریر کیا ہے دوسری تفصیلات سے قطع نظر اس نے کشمیریوں کی زندگی، ان کے خصائل، ان کے افلاس اور ان کے درد و غم کی روداد بڑی جگر کاوی سے اپنے سفرنامے میں درج کی ہے۔ مورکرافٹ کا سفرنامہ ایک بے ریا، مخلص اور ایک بڑے کشادہ دل انگریز کا سفرنامہ ہے۔ اس نے کشمیر میں کیا دیکھا اور کیا پایا، اس کا ایک سرسری اندازہ ذیل کے اقتباسات سے ہوتا ہے:-

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

۱۔ "کشمیر کے شہر کا عام کردار ایک دوسرے پر گری پڑی عمارتوں سے ظاہر ہوتا ہے جو تنگ و تاریک اور غلاظت سے بھری ہوئی پیچ در پیچ گلیوں کی بھول بھلیوں کو مشکل کرتی ہیں۔ گلیاں اس قدر تنگ ہیں کہ ان کے بیچوں بیچ گندی نالی ملتی ہے جس کے ہر طرف دلدل کا ایک حاشیہ ہے۔ مکان عام طور سے دو یا تین منزلہ ہیں جو بے جلی اینٹوں اور عمارتی لکڑی سے بنی ہوئی ہیں۔ بُری طرح کھڑی کی گئی یہ عمارتیں پلاسٹر سے محروم ہیں۔ دروازے لوٹے ہوئے ہیں یا بالکل ہی نہیں ہیں۔ کھڑکیوں پر کاغذ یا چیتھڑے لگے ہوئے ہیں اور چھت ایسے ہیں کہ اب گرے کہ اب گرے"[1]

سکھ عہد کے مظالم کے پس منظر میں عوام کی بدحالی ملاحظہ ہو:۔

۲۔ "..... لیکن لوگ ہر جگہ بہت ہی بُری حالت میں ہیں سکھ حکمرانوں نے ان پر ٹیکسوں کی بھرمار کردی ہے۔ ان کے افسران ہر قسم کے مظالم ڈھاتے ہیں۔ اس نظام کے ظلم و ستم کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں آبادی روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ پوری قابل کاشت زمین کا سولہواں حصہ کاشت کیا جاتا ہے

WILLIAM MOORCRAFT : TRAVELS IN HIMALAYAN PROVINCES OF HINDUSTAN P. 119 [1]

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

آبادی کا بیشتر حصہ اپنے گھروں میں بھوکوں مر رہا ہے
یہی وجہ ہے کہ لوگ بڑی تعداد میں ہندوستان کے
میدانی علاقوں کی طرف جا رہے ہیں۔ اور کشمیر کے لوگ
ہجرت سے نہیں بلکہ بیماری اور غربت کے باعث تیزی
سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔" ۱

۳۔ "ایک وقت میری فہرست میں چھ ہزار آٹھ سو مریض
تھے جن میں سے اکثر بہت سے لوگ مکروہ بیماریوں
کے شکار تھے۔ ایسی بیماریاں جو ناکافی خوراک، تاریک
اور سیل آلود مکانوں، میل کچیل اور بدکاری کی وجہ
سے پیدا ہوتی ہیں۔" ۲

۴۔ کشمیریوں کو ہمیشہ ایشیا کے زندہ دل اور ہنر
مند لوگوں میں خیال کیا جاتا رہا ہے اور وہ اس کے
مستحق ہیں۔ اگر انہیں آزاد خیال اور دانش مند
حکومت ملے تو وہ اخلاق مند اور عقلمند لوگوں میں
اونچا درجہ پائیں گے۔ لیکن موجودہ حالت میں ان
سے زیادہ پست کوئی اور قوم نہیں۔" ۳

۵۔ میرا خیال ہے کشمیریوں کی اخلاقی برائیاں یہاں

۱، ۲، ۳

WILLIAM MOORCRAFT : TRAVEL IN HIMALAYAN PROVINCES OF HINDUSTAN. P. 124, 124, 128.

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کے سیاسی حالات کی وجہ سے ہیں اور ان کے مزاج کے
باعث نہیں۔ ان کو تبدیل کرنا مشکل نہیں ہوگا
ان کے مزاج میں مذہبی تعصب نہیں ہے ۔ دونوں
فرقوں کے رہنما ملّا یا پنڈت جاہل ہیں۔ اور ان کا
لوگوں پہ کوئی اثر نہیں۔" لے

سر الیگزنڈر کننگھم

سر الیگزنڈر کننگھم ہندوستان میں آثار قدیمہ کی کھوج کا اوّلین
معمار سمجھا جاتا ہے ۔ پیشے کے لحاظ سے ایک فوجی افسر تھا۔ لیکن اس کی شخصیّت
ہمہ جہت تھی ۔ وہ ایک انجینئر، ایک جغرافیہ دان، ایک مورخ اور سب سے بڑھ
کر آثار قدیمہ کا بہت بڑا ماہر تھا اور یہ مہارت اس نے کافی جگر کاوی اور
ریاضت سے حاصل کرلی تھی۔ کننگھم کی آثار قدیمہ سے دِل چسپی کا باعث ۱۸۴۷ء
میں اس کی سیاحت کشمیر تھی۔ یہاں کے مندروں کو دیکھ کر اور ان کے فن تعمیر
سے وہ بہت متاثر ہوا تھا۔ اس موضوع پر کننگھم کی کتاب بہت اہم ہے۔ اس
کے کارناموں میں ہندوستان کا قدیم جغرافیہ، لداخ، ہندوستان کے قدیم سکے
ازمنۂ وسطیٰ کے ہندوستانی سکّے اور متعدد دوسری کتابیں ہیں جو کننگھم
کی دل چسپی کے رنگا رنگ موضوعات کی آئینہ داری کرتے ہیں ۔
کننگھم ہیون سانگ کے ذوق تجسّس کی تعریف کرتا ہے اور اس

WILLIAM MOORCRAFT: TRAVELS IN HIMALAYAN PROVINCES OF HINDUSTAN P. NO: 129 لے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کے اکثر بیانات کو صحیح تصوّر کرتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں اس سے اختلاف بھی کرتا ہے۔ ہیون سانگ کے عہد کے جغرافیائی حدود کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"ہیون سانگ کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے اسے چاروں طرف بڑے بڑے پہاڑوں سے گھرا ہوا بیان کرتا ہے، جو وادی کے لئے ایک صحیح بیان ہے مگر جب وہ کہتا ہے کہ اس کا حلقہ سات ہزار لی یا ۱۴۰۰ میل ہے تو اسے کشمیر کی سلطنت کی توسیعی سرحدوں کا ذکر کرنا چاہئے تھا نہ کہ صرف وادی کا جو صرف اپنے حلقے میں تین سو میل ہے لیکن اس کی سیاسی حدود کے علاوہ شمال سے سندھ اور جنوب میں راوی تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ فاصلہ نو سو میل سے کم نہیں ہو سکتا۔ اور شاید یاتری سیاح کے بتائے ہوئے اندازے تک پہنچا ہوگا۔" [۱]

مہاتما بدھ کے متبرک مقدس دانت کا ذکر یوں ہوتا ہے کہ اس دور کے مذہبی رجحانات کا بھی اندازہ ہوتا ہے :

"پرانی راجدھانی کے قریب ایک مشہور ستوپا تھا جس میں ۶۳۱ء میں مہاتما بدھ کا ایک مقدس دانت تبرک کے طور پر موجود تھا۔ لیکن ہیون سانگ کے پنجاب واپس لوٹنے سے قبل ۶۴۳ء میں یہ مقدس دانت راجہ نے ہرش وردھن کو دیا تھا جو قنوج کا طاقتور بادشاہ تھا اور جو کشمیر کی سرحدوں پر ایک جرار لشکر لے کر آدھمکا تھا۔ چونکہ راجہ

---

[۱] CUNNIGHAM : THE ANCIENT GEOGRAPHY OF KASHMIR. P.NO: 76-79

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دھرلب ایک برہمن تھا، اس لئے گوتم بدھ کے مقدس دانت
سے محرومی اس کے مذہبی مقاصد کے لئے سود مند تھا۔[1]

کننگھم کی علم جغرافیہ سے دلچسپی اس کے بیانات سے بار بار ظاہر ہوتی ہے
کشمیر کے قدیم شہروں کا نہ صرف اس نے ذکر کیا ہے بلکہ ان کی نشاندھی بھی کرتا ہے۔ یہ
بیان دلچسپی سے خالی نہیں:

"کشمیر کے قدیم بڑے شہر یہ ہیں: سرینگر کی پُرانی
راجدھانی، نئی راجدھانی، پرورسین پور، کھاگندرپور
اور کھنموشہ (جو اشوک کے عہد سے پہلے آباد ہوئے تھے)
وجی پور، اور پانتہ چھوک (یہ شہر اشوک سے منسوب ہیں)
مُرالوپر، کنشک پور، ہشک پور، جُشک پور (ہندی
سیتھی شہزادوں سے منسوب) للتادیتہ کے تعمیر کئے ہوئے
شہر پرہاس پور، پدم پور جو راجہ برہتی کے وزیر پدم کے نام پر
تعمیر ہوا تھا اور راجہ اونتی ورمن کا اونتی پور۔"[2]

بیرن چارلس ہیوگل

چارلس ہیوگل نے راجا رنجیت سنگھ والیٔ پنجاب کے دورِ حکومت میں کشمیر کی
سیاحت کی۔ کشمیر میں افغان حکومت ختم ہو چکی تھی اور سکھ عہد کا آغاز ہو چکا تھا۔ اگرچہ
یہ دور بھی کشمیریوں کے لئے اطمینان کا دور نہیں تھا، تاہم افغان دور کے مظالم سے

---

[1] CANNIGHAM: THE ANCIENT GEOGRAPHY OF KASHMIR P. 79-76

[2] " " " " " P. 80

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

چھٹکارا پاکر عوام نے سکون سے رہنا شروع کیا تھا۔ لیکن ابھی عوام کے معیار زندگی میں کوئی نمایاں فرق پیدا نہیں ہوا تھا۔ غلامی کی زندگی بدستور قایم تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ آقا بدل گئے تھے۔ ہیوگل نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنی سیاحت کی روداد قلمبند کی ہے۔ دوسرے سیلانیوں کی طرح اس کا دل بھی یہاں کے دل فریب مناظر دیکھ کر مچل اٹھتا ہے اور اپنے حسن بیان سے اپنے تاثرات کاغذ پر اتارتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ اپنے منصب سے بھی عہدہ برآ ہوتا ہے اور تمام جغرافیائی اور تواریخی باریک بینی کے ساتھ ان مقامات کی تفصیل پیش کرتا ہے جہاں جہاں وہ گھوما ہے۔ چند اقتباسات جن میں شاعرانہ تخیل کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں ملاحظہ ہوں :-

ا۔ "اپنے پہلے دن کے قیام میں میں نے کشمیر میں صرف کھنڈرات دیکھے۔ کھنڈرات — جو پہلے کبھی محل رہ چکے ہوں گے۔ سڑکوں کی غلاظت اور کثافت۔ اللہ کی پناہ! ..... ایک بڑی کشتی میں مچھیرنیاں بیٹھی تھیں۔ ان کی بے ہنگم آواز سے میں مبہوت ہو گیا۔ یہ "ونہ وُن" کی لے تھی جو باہر نالے سے آرہی تھی اور میرا پہلا تاثر تھا۔ اس پریوں کی سرزمین کا کہ جس کا میں نے سپنا دیکھا تھا۔ میں نے اپنی مایوس نظریں آدمی کی کارگذاری سے اُٹھا کر پُروقار پہاڑی مناظر کی طرف پھیر لیں، جہاں برفانی سفیدی سے بھری ہوئی ہزاروں چوٹیاں تھیں۔ ان کا وقار اس پُر سکون پہاڑی وادی کو منفرد حیثیت بخش رہا تھا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سیدھی سادی قدرت کی پُر وقار نیرنگی اور انسان کی
بے پناہ تشنہ آرزوئیں! کس قدر تضاد تھا۔ اور
اسی افراط و تفریط سے میرا دل جذبات سے بھر گیا۔
اور قدرت کے معصوم جمال کا عکس میرے دل پر مرتسم
ہو گیا۔ اور انسانی کارناموں کی اہمیت کے سائے پھیکے
پڑنے لگے۔ میں مجسم سوال بن گیا!

کیا میں نے پروردگار کی بارگاہ عالیہ میں اپنا شکرانہ ادا
کیا ہے جس نے مجھے اس جگہ پہنچنے کی سعادت بخشی ہے مجھے
کس قدر موقعہ فراہم ہوا ہے کہ میں اس کا شکرانہ ادا کروں
یا سنجیدگی سے غور و فکر کروں ؟ — یہاں میں ہوں ،
اس سرزمین پر — جو بعض لوگوں کے نزدیک دُنیا کا
خوبصورت ترین مقام تصور کیا جاتا ہے۔ یہ لڑکھڑاتے
ہوئے کھنڈر، انسانی عظمت کی ناپائیداری پر تصدیق کی
مہر ثبت کرتے ہیں۔ انسان نے جو چیز بھی تخلیق کی وہ تباہی
کی منزلوں سے گذر رہی ہے لیکن اس کے ساتھ تخریب
کا حسن شامل نہیں۔ جب کہ قدرت ہمیشہ کی طرح اسی توانائی
سرمستی اور زندگی کی تب و تاب کے ساتھ مہکتی ہے۔[1]

افغان عہد کے مقابلے میں لوگ مطمئن ہیں ہیوگل کے الفاظ میں :

---

[1] BARON CHARLES HUGEL : KASHMIR & PUNJAB P. 107

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

" لوگ عدل و انصاف سے مطمئن نظر آتے ہیں۔ انہوں نے میرے سامنے اعتراف کیا کہ بیس میں سے ایک آدمی کو اپنے جرائم کی سزا ملتی ہے۔ وحشتناک سزائیں، مثلاً معمولی جرائم کے لئے کان یا ناک کے کٹ جانے کا اب حکم نہیں ملتا جیسا ابتدائی حکمرانوں کے عہد میں ہوتا تھا۔ اس لئے لوگ آج کل کی مقابلتاً" نرم حکومت کی کارکردگی سے مطمئن ہیں۔ حقیقت میں اب گورنروں اور تھانے داروں کی طرف سے بہت کم مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔" ۱

رچرڈ ٹمپل

سر رچرڈ ٹمپل بارٹ نے جموں و کشمیر کی سیاحت ۸ جون سے ۸ جولائی ۱۸۵۹ء کے دوران کی۔ رچرڈ ٹمپل کئی کتابوں کا مصنف ہے۔ اپنی سیاحت کے دوران اس نے اپنی یادداشتوں کو ایک ڈایری کی شکل میں مرتب کیا۔ اس کی یہ ڈایری حیدرآباد، سکم، نیپال اور کشمیر کی سیاحت کے حالات پر مشتمل ہے۔ کشمیر سے متعلق اس کی ڈایری کے اوراق ایک قابل قدر مورخانہ مطالعہ پیش کرتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کشمیر میں سکھ عہد ختم ہو چکا تھا اور مہاراجہ گلاب سنگھ ڈوگرہ حکومت کی بنیاد ڈال چکا تھا۔ رچرڈ ٹمپل نے اپنی ڈایری میں ایک خوب صورت اسلوب برتا ہے۔ اور بڑی جگر کاوی سے یہاں کے عظیم اور قدیم تمدن کو کھنگالا ہے۔ جگہ جگہ گھوم کر یہاں کی قدیم عمارتوں اور کھنڈرات کی اصل کو سمجھنے کی کوشش کی اور ان کو وضاحت سے بیان کیا۔ وہ اونتی پورہ کے کھنڈرات کی نشاندہی چار

---

۱ BARON CHARLES HUGEL: KASHMIR & PUNJAB P. 156

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

میل لمبے رقبے پر کرتا ہے۔ اور اسی طرح پاندریٹھن (پران ادھشٹان) کے شہر کے کھنڈر دو میل پھیلے ہوئے رقبے پر بیان کرتا ہے۔ رچرڈ ٹمپل کے سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ایک سیلانی تھا بلکہ پتھروں کی زبان سمجھنے والا ماہر بھی تھا۔ مندروں اور وہاروں اور قدیم عمارتوں کو بہ نظر غائر دیکھنے والا یہ سیاح ڈوگرہ شاہی کے انتظامیہ پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالتا ہے۔ وہ کشمیر کے قدرتی مناظر دیکھ کر مبہوت ہو جاتا ہے رچرڈ ٹمپل کا سفرنامہ "کشمیریات" میں یقیناً ایک اضافہ ہے۔ چند اقتباسات سے اس کا بخوبی اندازہ ہوگا۔

ا۔ "شام کو ہم کھنڈرات دیکھنے چلے گئے۔ پہلا کھنڈر دریا کے کنارے ہے۔ اس کھنڈر کا بیشتر حصہ زمین کے اوپر نظر نہیں آتا۔ وہاں صرف پتھر اور ایسے نشانات ملتے ہیں جو صرف وسیع اور پھیلے ہوئے ڈھیروں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم جیبرار کے گاؤں میں چلے گئے جو قریباً" ایک میل کی مسافت پر تھا۔ یہاں مکمل کھنڈر ہیں جو زبان حال سے پکارتے ہیں کہ یہ کسی بڑے مندر کے ساتھ ملحق کسی عبادت گاہ کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ایسے ہی کھنڈرات ہم مارتنڈ میں دیکھ چکے تھے۔ مرکزی عمارت کی چھت اور اوپر کا حصہ زمین سے تھوڑا سا اُبھرا ہوا ہے اور نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ جو ملحقہ املاک ہے۔ اس کے نشانات ملتے ہیں۔ اس کے قریب پُرانے نشان

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

والے پتھروں کی تباہ کاری کا خیال کر کے دل مسوس اٹھتا ہے۔"[۱]

۵۔ شہنشاہ جہانگیر ویری ناگ کو اپنی وسیع و عریض سلطنت میں سب سے زیادہ پسند کرتا تھا۔ اور جب اس پر فالج گرا اور اسے یقین ہو گیا کہ موت قریب آگئی ہے تو اس نے خواہش ظاہر کی کہ اسے پنجاب سے ویری ناگ لایا جائے لیکن وہ کبھی بھی پیر پنچال نہ پہنچ پایا اور بہرام گلہ کے مقام پر انتقال کیا۔ یقیناً "یہ ایسی جگہ ہے جہاں آدمی موت کی نیند سونا پسند کرے۔"[۲]

رچرڈ ٹمپل کی ڈائری معلومات کا خزانہ ہے جسے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس سیاح نے بہت ہی قلیل عرصے میں اس قدر معلومات کہاں سے فراہم کی تھیں۔ جہاں کہیں وہ گھوما ہے وہاں کی ہر چیز کو اس نے ایک شاعر، ایک مورخ اور آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والے محقق کی نظر سے دیکھا ہے۔ اور اسے اپنی ڈائری میں درج کیا ہے۔

فرانسس ینگ ہسبنڈ

ینگ ہسبنڈ پہلی بار ۱۸۸۷ء میں کشمیر آیا۔ ہندوستان میں کئی عہدوں پر فائز رہا۔ کشمیر میں ریذیڈنٹ کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیئے۔ کشمیر سے اس کی دلچسپی اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ ۲۱ برس اس وادی میں رہا اور یہاں کے چپے چپے میں گھوما۔ ینگ ہسبنڈ نے اپنے تاثرات اپنی کتاب "کشمیر" میں درج کیے ہیں جو یہاں کی زندگی، یہاں

۱۔ SIR RICHARD TEMPLE BART: JOURNALS KEPT IN HYDERABAD, KASHMIR, SIKKIM & NEPAL. P.59

۲۔ IBID

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کی آب وہوا، پہاڑوں اور جھیلوں اور حسن قدرت کے جلووں کو بیان کرتی ہے۔ ینگ ہسبنڈ کے سینے میں ایک شاعر کا دل ہے وہ یہاں کے جلوۂ صد رنگ کو بیان کرنے کے لئے شاعرانہ اسلوب برتتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان جلووں کو دیکھنے کے لئے جگہ جگہ گھوما ہے اور ہزار زاویوں سے اس حسن دلنواز سے مسحور ہوا ہے۔

ایک اقتباس :

"کشمیر کے حسن کی کشش صرف یہ نہیں ہے کہ یہاں کا ہر مقام ہر دن ایک نئی جلوہ سامانی لے آتا ہے۔ روشن اور سہانے دن بہت زیادہ ہیں۔ لیکن پھیکے اور بے جان دن بھی پُرکشش ہیں۔"[۱]

مغرب کی جنّت سوئٹزرلینڈ کے ساتھ کشمیر کا موازنہ بہت خوب ہے۔ یہ سیاح سوئٹزرلینڈ کے قدرتی حسن سے بھی متاثر نظر آتا ہے لیکن جو چیز اُسے کشمیر کے پہاڑوں اور برف زاروں میں نظر آتی ہے وہ سوئٹزرلینڈ میں کہاں! کشمیر کا جہاں بھی ذکر کرتا ہے تو کھو سا جاتا ہے۔

ایک اقتباس :

"جس ملک کے ساتھ کشمیر کا موازنہ کیا جاسکتا ہے وہ قدرتی طور پر سوئٹزرلینڈ ہے۔ سوئٹزرلینڈ بلاشبہ بڑی خوب صورت جگہ ہے جو جھیلوں اور پہاڑیوں کے امتزاج سے کشمیر ہی سے بڑھ کر ہے لیکن یہ مقام ایک چھوٹی سی جگہ پر واقع ہے۔ وہاں کشمیر کی طرح برف سے لدے ہوئے

---

۱ YOUNG HUSBAND ... KASHMIR ...

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پہاڑوں کا پھیلاؤ نہیں ہے۔ وہاں ایسی کوئی جگہ نہیں
جہاں برفانی پہاڑوں کے مکمل ہالے کو دیکھا جاسکے جو
کشمیر کے طول و عرض کی طرح انہیں ہموار میدانوں میں
نظر آتا ہے۔ سوئیٹزرلینڈ کی مرکزی وادی کشمیر کی
وادیوں کے صرف اطراف کی طرح ہے۔ اس کے علاوہ
سوئیٹزرلینڈ کے پس منظر میں کشمیر کی طرح ایسے پہاڑوں
کا کوئی جلوہ نظر نہیں آتا جو دنیا کے کسی اور خطے میں بھی
عنقا ہے۔“ [۱]

سر والٹر لارنس

سر والٹر لارنس کا تعلق کشمیر سے گہرا رہا ہے۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد حکومت میں لارنس بندوبست اراضی کے اعلےٰ افسر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ اپنے منصبی فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں لارنس کو وادی کے بیشتر دیہاتوں اور خطوں میں گھومنے کا موقع ملا۔ اور اس نے نہایت قریب سے یہاں کے لوگوں کو دیکھا۔ لارنس کی قابلِ قدر کتاب ' ویلی آف کشمیر ' قیمتی معلومات کا خزانہ ہے۔ لارنس کا مطالعہ ایک سیلانی کا سرسری مطالعہ نہیں ہے۔ اس نے خلوص اور ہمدردی سے یہاں کے لوگوں اور ان کی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اُن کے دُکھ درد اور رنج و غم کے پس پشت جو محرکات رہے ہیں، ان کا ذکر کیا ہے۔ لارنس خاص طور پر پٹھان عہد کی سفاکیوں کا ذکر کرتا ہے

---

[۱] YOUNG HUSBAND: KASHMIR PAGE NO. 7-8

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کشمیریوں کے کردار کے بارے میں جو خیالات اس سے قبل کے سفرناموں میں ملتے ہیں۔
وہ ان سے اختلاف کرتا ہے اور یہاں کے روشن پہلوؤں کا ذکر بھی خلوص سے کرتا ہے
چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :

"میرا یہ خیال ہے کہ کشمیریوں کے بارے میں اکثر جو سخت
سُست باتیں کہی جاتی ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ ہے
کہ ان کے کردار کی ترجمانی کرنے والے اکثر غیر ملکی رہے
ہیں جو اکثر حالتوں میں رشوت خوار رہے ہیں۔ اور جن
کا رویہ غیر ہمدردانہ ہے۔ مغل، پٹھان، سکھ اور ڈوگرہ
گورنروں نے انتظامیہ میں ایسی کارکردگی انجام دی ہے
جو اُن کے آقاؤں کے سرچشموں سے پھوٹتا ہے۔ یہ
کہنا کہ کشمیری بے ایمان، غدار اور ظلم پرست تھے۔
پرانی کہانی ہے کہ "کُتے کو بُرا نام دو اور اسے ہلاک کرو"
مجھے اعتراف ہے کہ کشمیر میں اپنے منصبی فرائض کے
ابتدائی برس کے دوران میرا بھی ایسا ہی خیال تھا۔
لیکن بہت جلد میں نے محسوس کیا کہ ہر دوسرے مشرقی
کی طرح کشمیری کردار کے دو پہلو ہیں۔ تاریک اور روشن
کشمیری کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ اسے تنہا
چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ کھیت جوت سکے اور اونی
کپڑا بُن سکے۔ کشمیری کردار کا تاریک پہلو اس وقت
ابھرتا ہے جب کشمیری افسر کا سامنا کرتا ہے۔ وہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

حق بجانب ہے کہ وہ اُن سے نفرت کرے اور اُن پر اعتماد نہ کرے۔ اس صورت میں اس کا ہتھیار صرف یہ ہے کہ وہ دھوکہ دہی سے کام لے۔ لیکن اس کے کردار کا روشن پہلو اس وقت آئینہ ہو جاتا ہے جب وہ اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر اپنی رفیقۂ حیات اور بچوں کے درمیان بیٹھا ہو۔" ۱

۲ جب میں ۱۸۸۹ء میں پہلی بار کشمیر آیا، میں نے لوگوں کو بیزار، پریشان حال اور سہما ہوا پایا۔ سالہا سال تک ان کو سکھایا گیا تھا کہ وہ غلام ہیں جن کے کوئی حقوق نہیں ہیں۔ لیکن جن کے پاس بہت سی معذوریاں ضرور ہیں۔ ان کو ظلم پرست کہا جاتا رہا ہے اور ان کے طبقے کو ہر طرح کی سہولیت بہم پہنچائی جاتی تھیں۔ سپاہی ان کو مجبور کرتے تھے کہ وہ ہل چلائیں اور بیج بوئیں۔ لیکن وہی سپاہی فصل کاٹنے کے اوقات پر حاضر ہوتے تھے لوگ اپنے مکانوں سے باہر گھسیٹے جاتے تھے تاکہ وہ گلگت تک بلا اُجرت سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ ڈھو کر لے جائیں اور یہ کہ ہر افسر کو ان کی محنت اور ان کی جائیداد پر پورا پورا حق

SIR WALTER LAWRENCE
VALLEY OF KASHMIR P.5

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

حاصل تھا۔" ل

۳۔ کشمیر کے ہر طبقے کو اطمینان حاصل ہوا ہوگا۔ جب انہوں نے افغانوں کی سفاک حکومت کا زوال دیکھا ہوگا یہ اطمینان کسانوں سے زیادہ اور کسی طبقے کو حاصل نہ ہوا جن کی چمڑی کابل کے سفاک سرداروں نے اپنے "تشدد" سے ادھیڑ دی تھی۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ سکھ عہد میں اچھائی یا برائی تھی بلکہ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ عہد یقیناً "پٹھان عہد سے بہتر تھا"

ٹینڈل بسکو

ٹنڈل بسکو بلند مرتبت ماہر تعلیم جس نے کشمیر میں مغربی تعلیم کا پہلا چراغ روشن کیا، ۱۸۹۰ء میں کشمیر آیا۔ اور پھر اس کی زندگی کا بہترین زمانہ یہیں گزرا۔ اس نے پوری زندگی یہاں کے لوگوں کو مغربی علم اور مغربی مزاج سے روشناس کرانے میں صرف کی۔ سر والٹر لارنس کی طرح ٹنڈل بسکو نے اس بستی میں سال ہا سال گزارے اور یہاں کے سرد و گرم کو دیکھا اور محسوس کیا۔ بعض مغربی سیاحوں نے اپنے سفر ناموں میں کشمیریوں کے کردار کو منفی روپ میں پیش کر کے ...... اور یہ جتلانے کی کوشش کی کہ یہ لوگ دھوکے باز ہیں اور انہیں "انچار ؟" اور عزت کا کوئی لحاظ نہیں بسکو یہ بات جان گئے تھے کہ یہ ساری برائیاں جو کشمیریوں کی زندگی پر تھوپ

ل ے

SIR WALTER LAWRANCE: VALLEY OF KASHMIR P.2.

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دی گئی تھیں۔ دراصل اس ظلم و تشدد کے نظام کی دین تھیں۔ جس نے صدیوں سے
اس بدقسمت قوم کو غلام بنا رکھا تھا۔ بسکو اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں :

"لیکن وہ دنیا بھر کے لوگوں سے مختلف کیوں ہیں؟
کیونکہ وہ دنیا کی خوب صورت ترین جگہ پہ رہتے ہیں
اس لئے دوسرے لوگوں نے انہیں ہوس کا شکار بنایا ہے
کشمیر کو بار بار مفتوح بنایا ہے۔ درندا زوں نے بار
بار نہ صرف ان کے آباد و اجداد کو غلام در غلام بنایا۔
بلکہ ان کو قتل کیا اور ظلم و تشدد کی چکی میں پیس لیا۔
اور اس طرح ان کی روح کو ان کے جسم سے باہر
نکال دیا۔ اور ان کی شخصیت ختم کر دی۔ یہ بات
وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر ہم اہل برطانیہ
کو اس طرح کی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا، جس میں سے
ماضی کے دوران کشمیری گذرے ہیں، تو ہم نے اپنی
مردانگی کھوئی ہوتی۔" [۱]

بیسویں صدی کے دوران بیسوں دیگر سیاح آئے جن کے سفرناموں
کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔ ان کی یادداشتیں اس وادی دلفریب کے
نکھار کو نئی جہتیں عطا کرتی ہیں [۲]۔

---

[۱] BISCOVE TYNDALE:
KASHMIR IN SUNLIGHT & SHADE P. 79

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کشمیر ــــ لباس اور رہن سہن

کشمیر صدیوں سے بیرونی حملہ آوروں کی آماجگاہ رہا ہے ۔ اس کے قدرتی حُسن وجمال نے کتنے ہی دلوں کو بھرمایا ہے ۔ تاریخی اور نیم تاریخی شہادتوں سے یہ بات کھُل جاتی ہے کہ یہاں کے پہاڑوں، جھیلوں اور خوب رو پھولوں کی شاداب وادیوں نے کتنی ہی ہوس ناک نگاہوں کے قہر کو جھیلا ہے ۔ اور کتنے ہی صحراؤں کی خاک چھاننے والوں کو پناہ دے کر ان کی تہذیبوں کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے ۔ یہ قومیں جو مختلف زمانوں میں یہاں آئیں اکثر وبیشتر یہاں کی خاک دامن گیر میں جذب ہو گئیں ۔ بڑی بڑی سلطنتیں بنیں اور مسمار ہوئیں علم وعرفان کی ان گنت شمعیں فروزاں ہوئیں اور وقت کی تُند آندھی کے سامنے بُجھ گئیں یہاں کے پتھروں، مندروں، دہاروں، مسجدوں اور کھنڈروں کے پس پشت ایک نہ ختم ہونے والی پُر اسرار داستان چھُپی ہوئی ہے جو اہل نظر کو آج بھی دعوت فکر دیتی ہے اور ان زمانوں کی یاد دلاتی ہے جب انسان نے تاریخ، سائنس، نفسیات، علم البشریات اور دیگر علوم

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

وفنون کا درس حاصل نہیں کیا تھا۔

برزہامہ کے کھنڈر عیسٰی ؑ سے تین چار سو سال قبل کے زمانہ پر سے نقاب سرکاتے ہیں۔ ہاروں کی کھدائی سے ملی ہوئی چیزیں گنتان تہذیب پر روشنی ڈالتی ہیں جو پہلی صدی عیسوی میں کشمیر آئے۔ اس عہد میں یو۔چی قبیلہ کے لوگ بھی یہاں وارد ہوئے جن کو بعض تاریخ دان انہی کی ایک شاخ قرار دیتے ہیں۔ ان کے بعد ہُن آئے۔ ڈاکٹر ایس سی رے کا خیال ہے کہ سدا ہاروِن (موجودہ ہاروں) کے پرانے مقام سے بُت تراشی کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں وہ وسط ایشیائی قبیلوں کے نسلی خدوخال کو ظاہر کرتے ہیں یہ لوگ وادی میں چوتھی صدی عیسوی میں یا اس سے ذرا بعد میں یہاں آباد ہوئے[۱] ہُنوں کے بعد گوجارا قبیلے کے لوگ آباد ہوئے جن کا تعلق ہُن نسل سے تھا۔ ہُنوں کے بعد بھٹوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہوا اور سال ہا سال تک باہر سے آنے والوں کا یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری رہا۔

مختلف نسلوں اور رنگوں کے یہ لوگ یہاں آکر اس مٹی میں جذب ہو گئے اور اپنے پیش رؤں کے ساتھ اس طرح گھل مل گئے کہ ان کے درمیان خط تنسیخ کھینچنا محال ہے۔ یہاں کے جغرافیائی حالات نے اُن کی زندگی کے ہر شعبے کا عنوان بدل دیا۔ تہذیب اور تاریخ کی مختلف منزلوں میں سے گزرتے ہوئے ان لوگوں پر کیا بیتی اور وقت کے تقاضوں کے پیش نظر رفتہ رفتہ ان میں کون سی تبدیلیاں رونما ہوئیں اس کا مطالعہ خاصا دلچسپ ہے۔ یہاں صرف ان کے لباس اور رہن سہن کی تبدیلیوں کا مختصر ذکر کرنا مطلوب ہے۔

لباس اور رہن سہن کا تعلق محض انسان کی ستر پوشی تک ہی محدود نہیں اور نہ

---

[1] DR. S. C. RAY : EARLY HISTORY AND CULTURE OF KASHMIR PAGE 27-28

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

صرف یہ موسموں کے گرم وسرد سے تحفظ کا متقاضی ہے بلکہ دوسرے شعبوں کی طرح یہ انسانی تہذیب اور قومی روایات کی جڑیں دور دور تک اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ انسان کی سماجی اور تہذیبی زندگی میں لباس، رہن سہن اور طرزِ زندگی کا بنیادی رول ہے اس لئے جب ہم صدیوں پرانے زمانے کی تہیں کھرچتے ہیں تو اس آئینے میں ہم اس زمانے کی تصویر ٹٹول سکتے ہیں۔

دورِ قدیم

آر۔ سی۔ کاک کی قابل قدر تصنیف، جس کا تعلق قدیم یادگاروں سے ہے، پہلی صدی عیسوی کی تہذیبی زندگی پر خاصی روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں اس زمانہ سے تعلق رکھنے والے فنِ بُت تراشی کے چند نمونوں کی تصویریں ملتی ہیں۔ جو ہاروان سے دستیاب ہوئی ہیں۔ یہ کُشان عہد کی اینٹیں ہیں اور برزہامہ تہذیب کے بعد کے زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہاں ہم صرف ان کے ملبوسات کا ذکر کریں گے۔ ان تصویروں کا بغور مشاہدہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ:۔

۱۔ اس زمانہ میں عورتیں لہنگا کے مشابہ پیٹی کوٹ استعمال کرتی تھیں۔

۲۔ کسی باریک کپڑے کو ساڑھی کے مانند پہنتی تھیں۔

۳۔ مرد سر کو ڈھانپنے کے لئے پگڑی سے مشابہ کوئی چیز استعمال کرتے تھے۔

۴۔ جسم کو ڈھانپنے کے لئے چغے کے مانند کوئی باریک اور لمبا کپڑا استعمال کیا جاتا تھا۔

۵۔ موسیقار خواتین پاجامہ کی طرح کوئی چیز استعمال کرتی تھیں۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

۶۔ رقاصائیں ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنتی تھیں۔ یہ کپڑے پاجامہ آستینوں

والی قمیص اور اوڑھنی پر مشتمل ہوتے تھے۔

۷۔ مرد لہنگا کے مانند کپڑا باندھتے تھے جس کا لچکا لٹکا رہتا تھا۔

۸۔ کمر کسی کپڑے سے بندھی رہتی تھی۔

۹۔ عورتوں کے بال سجے ہوئے ہوتے تھے۔ بالوں میں جوڑا باندھا جاتا تھا۔ اور کانوں میں بڑی بڑی بالیاں ہوتی تھیں۔

۱۰۔ سجاوٹ اور زیبائش بے مثال ہوتی تھی۔

ڈاکٹر رے کے مطابق یہ ملبوسات جن کا عکس ہارون کی اینٹوں میں ملتا ہے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ان پر بلاشبہ وسط ایشیا کے لباس کا اثر نمایاں ہے[1] لیکن ان ملبوسات کے بارے میں حتمی طور پر یہ متعین کرنا کہ ان کا استعمال وسط ایشیائی طرز میں کب ہوا، مشکل ہے۔ بامزئی کا خیال ہے کہ ان ملبوسات پر وسط ایشیائی اثرات غالباً عیسوی سنہ کی شروع کی صدیوں میں ہوا ہوگا[2] آر۔ سی۔ کاک کی تصنیف "کشمیر کی قدیم یادگاریں" میں ہارون ٹائیلز سے متعلق جو پلیٹیں موجود ہیں ان میں سے چند ایک کی تفصیل ملاحظہ ہو:۔

۱۔ مرد ۔ بائیں ہاتھ میں کنول کی کونپل لئے ہوئے

ایک گھوڑ سوار، زرہ بکتر پہنے ہوئے کمان کھینچتے ہوئے اور پوری رفتار سے گھوڑا دوڑاتے ہوئے۔ اس کے دائیں طرف زمین کے ساتھ بندھا ہوا ترکش، پیٹھ پر کپڑے کے دوسرے لہراتے ہوئے[3]

۲۔ شفاف لباس میں ملبوس شبیہ۔ اپنے بائیں طرف قدم بڑھاتے

---

1. DR. S. C. RAY: EARLY HISTORY AND CULTURE OF KASHMIR P.256
2. P.N.K. BAMZAI: A HISTORY OF KASHMIR PAGE 238
3. R.C. KAK: ANCIENT MONUMENTS OF KASHMIR PLATE XXIII (4)

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہوتے۔ سر پر سختی سے چپکی ہوئی پگڑی، کانوں میں لمبی لمبی بالیاں

آویزاں۔ [1]

۳۔ پنہارن، پانی کے دو برتن اٹھائے ہوئے۔ دائیں طرف باریک

کپڑے اور جمپر پہنے ہوئے عورت۔ اوپر اٹھے ہوئے بائیں ہاتھ میں

گل دان یا مشک دان اور بائیں ہاتھ سے لہنگا تھامے ہوئے ہے۔ [2]

۴۔ زنانہ موسیقار۔ پاجامہ پہنے ہوئے، بائیں کندھے سے لٹکے ہوئے

ڈھول کو بجا رہی ہے۔ کانوں میں بالیاں پہنے ہوئے ہے۔ [3]

(ساتھ میں ایک مرد کی تصویر جس کی کمر بندھی ہوئی ہے اور لہنگا بندھا

ہوا جس کا لچکا لٹک رہا ہے)

۵۔ ایک رقاصہ ـــ کانوں میں بڑی بڑی بالیاں۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑوں

میں ملبوس دونوں ہاتھوں سے سر کے اوپر پھیلا ہوا سکارف تھامے

ہوئے ہے۔ [4]

(اس لباس میں آجکل کی رقاصاؤں کے ملبوسات کا اسٹائل ہے

بال خوبصورتی سے گوندھے ہوئے" ڈھیلا ڈھالا پاجامہ اور قمیص)

لباس کے ساتھ ساتھ زیورات اور آرائش و زیبائش کی اہمیت زمانہ قدیم میں

بھی اسی طرح تھی جس طرح زمانہ حال میں ہے۔ اُدسکر سے بت تراشی کے جو نمونے

---

[1] R.C. KAK: ANCIENT MONUMENTS OF KASHMIR PLATE XXIV (5)

[2] " " " " " XXV (B)

[3] " " " " " XXVII (11)

[4] " " " " " XXVII (12)

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دستیاب ہوئے ہیں ان کے مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ بڑی آن بان اور ذوق و شوق سے اپنی آرائش کا سامان کرتے تھے۔ حتیٰ کہ طرح طرح کے زیورات کا استعمال عام تھا۔ کلہن نے راج ترنگنی میں قدیم زیورات کا استعمال عام تھا۔ کلہن نے راج ترنگنی میں قدیم زیورات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے مطابق خواتین کنگن، پازیب، بالیاں وغیرہ استعمال کرتی تھیں۔ [1] کھیمندر کی تحریروں میں بھی جواہرات سے مرصع کالر کا ذکر ملتا ہے۔ اسی طرح کئی قدیم پادشاہوں میں ماتھے کی افشاں اور چوٹی کو باندھنے والے سنہرے دھاگے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ خواتین کے ساتھ ساتھ مردوں کے زیورات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں بازو بند، کنگن، ہار، انگوٹھی، بالیوں وغیرہ کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ ڈاکٹر رے نے اس کے علاوہ فولادی تلووں والے جوتوں لکڑی کی بنی ہوئی سینڈلوں، کمر سے لٹکنے والی تلواروں کو مردوں کے پہناوے میں شامل کیا ہے آر۔ سی۔ کاک کی ہینڈ بک ARCHEOLOGICAL AND NUMISMATIC SECTION OF S.P.S MUSENM SGR. کے حوالے سے ڈاکٹر رے رقم طراز ہیں:۔

"اُوسکو سے حاصل کئے ہوئے بُت تراشی کے ٹکڑوں میں کہنی سے اوپر کے بازو میں تسبیح کے دانوں والا بازو بند ملا ہے۔ جو اسی طرح کے ایک ہاتھ سے نیکلیس کے ساتھ جڑا ہوا دکھائی دیتا ہے دوسرے بازو میں کلائی کے گرد ایک کنگن ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ٹوٹے ہوئے بائیں ہاتھ کی چھنگلی میں ایک انگوٹھی ہے۔" [2]

ایک اور جگہ یوں لکھا ہے:

"پاندریٹھن سے حاصل کئے ہوئے ایک بودھی ساتھوا الوکی تیسور کی مورتی ملی ہے جو بھاری بھرکم زیورات سے لدی پھندی ہے۔ اس میں

---

[1] کلہن راج ترنگنی جلد اول ص ۳۴۰ (مترجمہ ارل سٹین) مکرر اشاعت ۱۹۷۹ء

[2] DR. S.C. RAY: EARLY HISTORY AND CULTURE OF KASHMIR PAGE 256

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تین سروں والا مکٹ، ایک مرصع نیکلیس، جواہرات سے سجا ہوا کنگن
اور کمر میں بندھا ہوا ایک کمر بند دیکھا جا سکتا ہے۔ جو دھوتی کے ساتھ
بندھا ہوا ہے۔ یہ زیورات عام سماجی زندگی سے لئے گئے ہوں گے۔ اونتی
پورہ کی ایک وشنو مورتی کے سر پر تین سروں والا مرصع مکٹ سجا ہوا
ہے جس میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ جواہرات جڑے ہوئے ہیں
یہ عین ممکن ہے کہ ایسے ہی ہلالی شکل کے تاج اس زمانہ میں یہاں کے
راجے استعمال کرتے رہے ہوں۔ کلہن کا کہنا ہے کہ راجہ اننت پانچ
سروں والے نور پاش ہلالی مکٹ کو استعمال کرتا تھا"۔[1]

ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ مورتیوں کو زیورات سے سجایا ہوا دکھایا گیا ہے اور یہ زیورات محض تخیل
کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق یہاں کی مقامی زندگی سے ہے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ
یہاں اس طرح کے زیورات استعمال کئے جاتے رہے ہوں گے جن کا عکس ان مورتیوں میں دکھایا
گیا ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ان کا بیشتر حصہ راجاؤں، رانیوں اور امراء کے یہاں استعمال کئے
جانے والے زیورات سے لیا گیا ہوگا۔ لیکن مورتیاں بنانے والے اور پتھروں کو کاٹ کاٹ کر انسانی
شبیہہ بنانے والے عام لوگ ہی رہے ہوں گے۔ اس لئے ان کی اپنی زندگی کا عکس کسی نہ کسی
پہلو سے ان مورتیوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اس دور میں عام لوگوں کے رہنے بسنے کا سلیقہ شائستہ تھا۔ وہ اپنے فرصت کے
لمحات میں تفریح طبع کا سامان کرتے تھے۔ موسیقی ہر دور کی طرح روح کی غذا تھی۔ لوگوں
کو رقص و ناٹک سے دلچسپی تھی۔ ہاروان کی ایک ٹائیل پر ایک زنانہ موسیقار کو دیکھا
جا سکتا ہے جو ڈھول بجا رہی ہے۔ دوسری عورت رقص کرتی ہوئی دکھائی گئی ہے۔ کلہن

[1] DR. S. C. RAY: EARLY HISTORY AND CULTURE OF KASHMIR PAGE 256

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کے مطابق اس زمانے میں رقص و موسیقی کی محفلیں بڑے بڑے ہالوں میں منعقد ہوتی تھیں اور لوگ بڑے چاؤ سے ان میں شریک ہوتے تھے[1]۔ اسی زمانے میں "رتناولی نام کا" ڈراما تخلیق ہوا۔ ناٹیہ شاستر کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور رقص کی باضابطہ تربیت ہوتی تھی۔ کٹھ پتلی ناچ کا رواج بھی تھا۔ رسل ورسائل کے ذرائع محدود تھے۔ سواری کے لئے گھوڑے کشتیاں، ہاتھی، پالکیاں عام طور سے استعمال ہوتی تھیں۔ ہاروان کی اینٹوں پر ہاتھی کی تصویر اس بات پر تصدیق کی مہر ثبت کرتی ہے کہ اس زمانہ میں ہاتھی ملتے تھے کلہن نے بھی ہاتھیوں کا ذکر کیا ہے[2]۔

نیل مت پران چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کے آس پاس لکھا گیا[5]۔ جو زمانہ قدیم کی کشمیری تہذیب و تمدن کے کئی اسرار کھولتا ہے۔ نیل مت میں لباس کے لئے وستر، امبر، واسس، داسنا اور سام وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں[3]۔ اس میں چین سے درآمد کئے ہوئے ریشم کا نام "من موسکا" بتایا گیا ہے۔ "کمبلہ" اونی کمبل کے لئے اور "پرہارنہ" نمائے برف باری کے وقت پہنے جانے والے لباس کے لئے مستعمل ہوا ہے پروارہ ذکر مہابھارت میں بھی ہوا ہے[4] اور یہ لباس کڑاکے کی سردی میں سردی سے تحفظ کرتا تھا۔ نیل مت پران کے مطابق کشمیری لباس دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصہ جسم کے اوپر والے حصے کو ڈھانپتا تھا۔ اور دوسرا حصہ دھڑ کے نچلے حصے کو یہ دونوں حصے سفید بھی ہوتے تھے اور رنگ دار بھی۔ بعد کے سالوں میں بودھ بھکشوؤں نے جس لباس کا استعمال شروع کیا وہ بودھ ادب

---

[1] کلہن : راج ترنگنی جلد اوّل ص ۳۵۶ (مترجمہ ارل سٹین) مکرر اشاعت ۱۹۷۹ء

[2] " " " " " "

[3] ڈاکٹر وید کماری گھئی :۔ نیل مت پران جلد اول ص ۱۱۶

[4] " " " "

[5] بعض محققین کے مطابق نیل مت پران کا زمانہ عیسیٰ سے قبل کا زمانہ ہے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

میں سوارا (CIVARA) کہلاتا ہے۔ نئے کپڑوں کے لئے " اہتمہ " (AHATA) کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ اپنے پیش روؤں کی طرح یہ لوگ بھی زیورات اور آرائش وزیبائش کے شوقین تھے۔ اس وقت بھی کانوں میں بالیاں پہننے کا رواج تھا۔ نیل مت پُران میں مکٹ، مالا، بازوبند، بالی اور جواہرات کا ذکر بار بار آیا ہے۔ یہاں کئی خوشبوؤں کا ذکر بھی ملتا ہے جن کا استعمال اکثر ہوتا تھا۔ پوجا کے وقت لوگ نہ صرف مورتیوں کو مالاؤں سے آراستہ کرتے تھے بلکہ ان کو خوشبوؤں سے بھی معطر کرتے تھے۔ نیل مت میں مرصع کاری اور مشک باری کی تفصیل ملتی ہے۔ مثلاً یہ کہ لوگ جسم کی مالش خوب کرتے تھے۔ جسم کو ملائم بنانے کے لئے مالش کے عمل کو " اُدوَرتنہ " خوشبو سے تر کرنے کو " اُت سادھنہ " اور نہانے کے بعد صندل کی لیپ کو ملنے کے لئے " انولیپنہ " کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔[1]

زیر بحث زمانہ میں زمانہ حال کی طرح پوجا میں اناج کی مختلف اقسام استعمال ہوتی تھیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی خوراک یہی سب چیزیں تھیں۔ ان میں سے خاص طور پر دالوں اور ترکاریوں کا ذکر آیا ہے۔ گمان غالب ہے کہ اس دور میں گوشت کا استعمال ہوتا تھا۔ ڈاکٹر وید کماری رقمطراز ہیں۔

" گمان ہے کہ گوشت بھی خوراک کا اہم جز تھا۔ ورنہ بھگوان وشنو سے منسوب کئے ہوئے پانچ دنوں میں گوشت کے استعمال پر زبردست ممانعت کی ضرورت نہ تھی۔ حتیٰ کہ ایک جگہ پر وشنو کی مورتی کی پوجا جانوروں کے گوشت کی آہوتی دے کر بیان کی گئی ہے۔"[2]

نیل مت پُران میں خوراک کی ایک طویل فہرست درج ہے۔ چند ایک چیزیں

---

[1] ڈاکٹر وید کماری گئی: نیل مت پران جلد اول ص ۱۱۷ - ۱۱۸

[2] ایضاً ص ۱۱۹

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

لیوں ہیں :-

اپیید (خالص مکھن) اپلوپا (گھی میں بنا ہوا چاول یا جو کا کیک)

دوہی (دہی) دھانیہ (دھان) دراکشا (انگور) گھرتا (خالص مکھن) گوسا

گھرتہ پیاسا چاول، مکھن، دودھ سے بنا ہوا ایک قسم کا دلیہ)

داڑی ما (انار) اکشو بھیت، گڑ، کھنڈ، سرکارا، اکسوس، ستو یالا، گڑی وغیرہ

(شکر اور شکر رس سے بنی ہوئی مختلف کھانے پینے والی چیزیں) لوان (نمک)۔

اسی طرح دوسری اشیاء میں الاکتا (پیروں کے رنگنے کے لئے لال رنگ)

چندن (صندل) گرو کانا (نہانے کے لعد استعمال کیا جانے والا پیلا رنگ) مدھو (شہد)

پان (عام قسم کی شراب) مدھیا (شراب) کُمکُم (کیسر) سوم (دیوتاؤں کی شراب) کے نام

قابل ذکر ہیں۔ نیل مت پران میں ایسی اور بھی بیسیوں اشیاء کے نام گنوائے گئے ہیں جن

میں کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ خوشبوئیں، مصالحہ جات وغیرہ شامل ہیں۔

رقص، موسیقی، ناٹک اور دوسرے فنون لطیفہ سے قدیم کشمیریوں کی دلچسپی انکی

کشادہ ذہنی، خوش مذاقی اور عادات و آداب کی خوش مزاجی پر دال ہے۔ نیل مت کا مطالعہ

بتاتا ہے کہ سرزمین کاشمیر کی فضا زمانہ قدیم میں بھی خوش طبع اور خوش مزاج لوگوں سے

معمور تھی۔ مذہبی، نیم مذہبی اور عوامی زندگی سے تعلق رکھنے والی تقریبوں پر موسیقی خاص

دخل تھا۔ حتیٰ کہ نئی برف باری یا کھیتوں میں بیج بونے کے وقت آس پاس کی فضا

موسیقی کی رسیلی لہروں سے جھوم اٹھتی تھی۔ نیل مت پران کے حوالے سے ڈاکٹر وید کماری

کا یہ بیان ملاحظہ ہو :-

"بھگوان وشنو کے آرام یا عالم بیداری کے سماں کی خالص مذہبی

تقریب ہو، نیکمبھ کی آمد یا وداع کی نیم مذہبی تقریب ہو یا پھر نئی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

برف باری یا نئے بیج بونے کی موسمی تقریب ـــــ موسیقی کو ہر وقت بڑا دخل ہے، گانے کو بھی اور بجانے کو بھی؛[1]

موسیقی کے ساتھ ساتھ عوامی زندگی میں رقص کی بڑی اہمیت تھی۔ مذہبی تقاریب سے قطع نظر روزمرہ کی زندگی میں رقص کا بڑا دخل تھا۔ موسم بہار کا استقبال رقص سے ہوتا تھا۔ اسی طرح زراعت سے متعلق جتنی تقریبیں ہوتی تھیں رقص کے بغیر نامکمل تھیں۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ رقص و موسیقی سے کشمیریوں کی دل چسپی کا حال ہاروں کی اینٹوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صرف مردوں کا ہی میدان نہیں تھا بلکہ عورتیں بھی اس فن کی ماہر تھیں اور برابر اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ کلہن، کھیمندر اور بلہن نے بھی اپنی تحریروں میں رقص کے ساتھ خواتین کی وابستگی اور دل چسپی کا ذکر بار بار کیا ہے۔ کلہن نے مندروں کے ساتھ رقاصاؤں کے تعلق کا بھی ذکر کیا ہے۔ واسوگپت کے فلسفیانہ سوتروں میں اسی فن کی بنیاد پر تشبیہات کا استعمال کیا گیا ہے۔ وہ آتما کو رقص، انتر آتما کو تھیٹر اور اندریوں کو تماشائی کہتا ہے۔[2] یہ بات قابل ذکر ہے کہ موسیقی کا تعلق زیادہ تر لوک سنگیت کے ساتھ تھا۔ مذہبی تیوہاروں پر جس طرح کے رقص ہوتے تھے وہ عام طور سے دیوتاؤں سے متعلق ہوتے تھے۔ باقی تقاریب پر ہونے والے رقص عوامی زندگی سے تعلق رکھتے تھے۔ نیل مت پران میں مصوری کا ذکر آیا ہے۔ کشمیری پنڈتوں کے یہاں آج بھی شادی بیاہ کے موقعوں پر دائرے کی شکل میں رنگوں کا جو منڈل آنگن میں بنایا جاتا ہے اور جسے "ویوگ" کہا جاتا ہے اسی زمانہ کی یادگار ہے اور "بھوجی سوبھا"

---

[1] ڈاکٹر وید کماری گئی: نیل مت پران جلد اوّل ص ۱۰

[2] ایضاً ص ۹۹

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سے اخذ کیا ہوا ہے جس کا ذکر نیل مت پران میں کیا گیا ہے ۔[1]

دیگر فنون میں بھی اہل کشمیر کسی دوسری قوم سے کم تر نہ تھے ۔ یہ لوگ فن تعمیر سے واقف تھے ۔ چنانچہ نیل مت پران میں مندروں، مکانوں، سڑکوں، چوراہوں وغیرہ کا ذکر ملتا ہے ۔ صنعت و حرفت میں بھی یہ لوگ دسترس رکھتے تھے ۔ یہ لوگ کپڑے کی کتائی، بنائی، رنگائی، دھلائی سے بھی جان کاری رکھتے تھے ۔ ان کو زیورات پہننے کا شوق تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اُس فن میں طاق تھے ۔ میدان جنگ میں استعمال کئے جانے والے ہتھیار بنانا جانتے تھے ۔ اسی طرح مٹی، چمڑے اور لکڑی کی مختلف چیزیں بھی بنانا جانتے تھے ۔ مویشیوں کی خاصی تعداد یہاں ملتی تھی ۔ جن میں گائے، گھوڑے اور ہاتھی اور بیل وغیرہ شامل تھے ۔ باربرداری کے کام میں گھوڑوں، بیلوں اور گائیوں کی بڑی افادیت تھی ۔ لہذا مذہبی اعتبار سے اُن کی بڑی اہمیت تھی اور "گو میر سبھا" رسومات سے ان کی پوجا ہوتی تھی ۔[2] کشمیری پنڈتوں کے یہاں اس رعایت سے گائے یا بیل کا دان موت کی رسومات میں شامل ہے ۔ جس کے اعتبار سے موت کے بعد "یم لوک" کو پار کر کے سورگ کے راستے کو پایا جاسکتا ہے ۔ کشمیری پنڈتوں میں آج بھی کھانا کھانے سے پہلے کتوں اور کوؤں کا حصہ الگ رکھ دینے کا رواج ہے ۔ حتیٰ کہ کوؤں کا جنم دن ہر سال ماگھ شکلہ پکش کی پورنماشی (ماگھ کے روشن پندرھواڑے کی پندرھویں) کو منایا جاتا ہے ۔

---

[1] ڈاکٹر وید کماری گئی، نیل مت پران جلد اوّل ص 115

[2] ایضاً " 125

جسے "کاؤ پنیم" کہا جاتا ہے ۔[1]

ہندو عہد

کافی زمانہ بیت جانے کے بعد ساتویں صدی عیسوی میں چینی سیاح ہیون سوانگ ہندوستان کی سیاحت کے لئے آیا۔ کشمیر میں اس کا قیام لگ بھگ دو سال (۶۳۱ - ۶۳۳ء) تک رہا۔ اس نے اپنے مشاہدے کی بنیاد پر جو یادداشتیں اپنی کتاب میں درج کی ہیں ان میں شمالی ہندوستان کے ملبوسات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو :-

"جہاں ہوا خنک ہے ۔

---

[1] بہت سارے تیوہار اب آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ آنے والی نسل ان کا ذکر صرف تواریخوں میں پڑھے گی۔ کاؤ پنیم ایک ایسا ہی تیوہار ہے۔ ماگھ پورنماشی کو ہر سال کوؤں کی سالگرہ بڑے چاؤ سے منائی جاتی تھی۔ ہر پنڈت گھروں میں پر پھیلائے ہوئے کوے کا پتلا لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے بنایا جاتا تھا۔ جس پر بڑی صفائی سے تیار کیا ہوا بھات گھاس اور پتوں سے بنی ہوئی ایک پیالی میں رکھ دیا جاتا تھا۔ یہ بچوں کے لئے خاص طور سے ہنسی مذاق کا وقت ہوتا تھا۔ وہ اپنی ننھی منی آوازوں سے میاں "آگے" "کو" پکارتے تھے اور دعوت شیراز میں شریک ہونے کی درخواست کرتے تھے۔ چاروں طرف فضا میں توتلی آوازوں کا زیر و بم سنا جا سکتا تھا۔

ارے میاں کاگے !

کھچڑی کے رسیا کاگے !

گنگابل کے پانیوں سے نہا کر !

لال مٹی کا تلک لگا کر آ !

آ ! ہمارے نئے گھر کی منڈیر پہ بیٹھ جا

اور ہماری دعوت میں شریک ہو جا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

مرد اپنے لباس کو جسم کے درمیان میں لپیٹ لیتے ہیں۔ پھر اسے اپنی بغلوں
کے بیچ میں سے نکال کر اپنے جسم پہ دائیں طرف لٹکا دیتے ہیں۔
عورتوں کا لباس نیچے زمین تک لٹکا رہتا ہے اور ان کے کندھے ڈھک
جاتے ہیں۔ لوگ سروں پر ٹوپیاں پہنتے ہیں جن کے ساتھ مالائیں اور
جواہرات سے سجے ہوئے گلے کے زیور بھی ہوتے ہیں۔"[1]

مورخ حسن نے بھی دورِ قدیم کی پوشاک کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لوگ پنج
لباس پہنتے تھے جن میں کرتہ، پاجامہ، درمہ، کاڑن، لونگی شامل تھا۔[2] درمہ کی وضاحت کرتے
ہوئے حسن نے لکھا ہے کہ یہ سات یا آٹھ گز لمبا اور آدھ گز چوڑا مالیدہ پٹو ہوتا تھا۔ جس
کا پہلا پیچ سر پہ دوسرا پیچ ہاتھوں پر اور تیسرا پیچ زیر بغل ہوتا تھا۔ اور لپیٹ طرفین
گردن پر لٹکی رہتی تھیں۔ گمان غالب ہے کہ یہی پوشاک ہوگی جس کا ذکر ہیون سانگ
نے کیا ہے۔ حسن نے "کاڑن" کا لفظ بھی استعمال کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ مہین پٹو ہوتا
تھا جو دس یا بارہ گز لمبا اور پانچ یا چھ گز چوڑا ہوتا تھا اور سر پہ باندھا جاتا تھا۔ جس لہنگے
کا ذکر آگے ہوا ہے اسے حسن نے پیشواز کی طرح کی پوشاک بتایا ہے۔[3]

اس بیان میں ملبوسات کا جو ذکر ملتا ہے۔ اس کی تصدیق کارکوٹ عہد میں بھی ہوتی ہے
کلہن کے مطابق اس زمانہ میں لوگ ایک لمبا چغہ پہنتے تھے۔ جو کندھوں سے ٹخنوں تک
لمبا ہوتا تھا۔ یہ چوغہ کمر بند کی مدد سے کمر کے ارد گرد بندھا رہتا تھا۔ وہ نیم آستینوں

---

[1] بحوالہ پی۔ این۔ کے بامزئی: ہسٹری آف کشمیر ص ۲۳۷
[2] حسن: تاریخ حسن جلد اول ص ۵۲ھ
[3] ایضاً

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

والا جیکٹ یا بلاوز بھی استعمال کرتے تھے[1] غریب لوگ سردی کی وجہ سے موٹا کمبل اور فارغ البال طبقہ عمدہ کمبل استعمال کرتا تھا۔ یہ اس قدر ڈھیلا ڈھالا ہوتا تھا کہ اس میں آسانی سے کانگڑی[2] کو تاپا جاسکتا تھا۔ پاؤں میں لکڑی کے کھڑاؤں استعمال ہوتے تھے اور امراء ہوروں کی شکل والے جوتے پہنتے تھے۔ چمڑے کے جوتے بھی استعمال ہوتے تھے۔ ہندو دور کے آخری راجے سفید رنگ کی پگڑی کا استعمال کرتے تھے۔ عورتیں زیورات کی شوقین تھیں اور گلے کا ہار، کنگن، بازو بند اور بالیاں استعمال کرتی تھیں۔ راجہ ہرش زیورات کا دلدادہ اور رنگین مزاج تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے لئے بلکہ اپنے درباریوں اور اپنی رانیوں کے لئے بھی زیورات کے نئے نئے فیشن رائج کئے تھے[3] ایسے زیورات میں ماتھے کا جھومر اور بالوں کی چوٹی میں باندھا جانے والا سنہری دھاگا بھی شامل تھا۔

ہندو دور حکومت میں چاول کو خوراک میں بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ چاول کو کئی طرح سے پکایا جاتا تھا۔ راج ترنگنی میں تلخ ذائقہ والے اتپل ساگ (اوپل ہاکھ) کا ذکر آیا ہے[4] جو پہاڑی ڈھلوانوں پر اگتا تھا اور جسے غریب لوگ استعمال کرتے تھے۔ انگور، خوبانی اور ناشپاتی شوق سے کھائے جاتے تھے۔ پیاز کا استعمال ہوتا تھا۔ کھشمندر کے مطابق نمک صرف اُمراء استعمال کرتے تھے کیونکہ یہ کافی دور سے لایا جاتا تھا اس لئے مہنگا بھی ہوتا تھا۔ عام لوگ اسے خرید نہیں سکتے تھے۔ گوشت کے استعمال پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ صرف کبوتر اور گلہری کا گوشت کھانا معیوب سمجھا

---

[1] کلہن: راج ترنگنی جلد اول (مترجمہ ارل اسٹین) مکرر اشاعت ۱۹۷۹ء ص ۳۸

[2] کانگڑی کا قدیم نام "کاستھان گاریکا" بتایا جاتا ہے

[3] بامزئی: ہسٹری آف کشمیر ص ۲۳۸

[4] کلہن: راج ترنگنی جلد اول ص ۱۹۵

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

جاتا تھا۔ گوشت عموماً بھون کر کھایا جاتا تھا اور اسے خوب مرچ مصالحہ میں تیار کیا جاتا تھا۔ مچھلی کا استعمال خوب ہوتا تھا اور اس کا شوربہ پسند[۳] عام تھا۔ شراب کا استعمال ہوتا تھا۔ انگور کا رس شراب میں کشید کیا جاتا تھا۔ شراب ٹھنڈی کی جاتی تھی اور اسے پھولوں کی خوشبو سے معطر کیا جاتا تھا۔ امراء میں پان کھانے کا رواج تھا۔ کلہن نے ایک طرح کے کافور 'پوٹیسا' کا بھی ذکر کیا ہے۔ کشمیری زعفران کی مانگ سارے ہندوستان میں تھی۔

اس زمانے میں راجاؤں، رانیوں اور درباریوں نے کئی قصبے اور شہر آباد کئے۔ سال کے بیشتر دن سردیوں کی نذر ہو جاتے تھے۔ اس لئے سردی سے بچنے کے لئے مکانوں کی خاصی تعداد تعمیر ہوتی رہتی تھی۔ راجاؤں کے لئے بڑے بڑے محل اور حویلیاں بنتی تھیں عام لوگ لکڑی کے مکانات اور جھونپڑوں میں رہتے تھے۔ لیکن بڑے بڑے مندر مٹھ اور وہار غریبوں کے لئے رہائش کا سامان بہم پہنچاتے تھے دوسری جگہوں سے آنے والے طلباء کے لئے بورڈنگ ہاؤس موجود تھے۔ یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ ماقبل تواریخ کے دور میں لوگ گڈھوں رہتے تھے جن پر گھاس کی چھتیں ہوتی تھیں۔ لیکن زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ مکانوں کی ہیت میں تبدیلی رونما ہونے لگی۔ حتیٰ کہ پرورسین دوم (چھٹی صدی عیسوی) کے عہد میں جب موجودہ سرینگر کی بنیاد ڈالی گئی تو سربفلک عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا۔ بامزئی کے مطابق اس زمانہ میں کشمیر اپنی پانچ خصوصیات[۱] کے لئے مشہور تھا اور ان میں سے ایک خصوصیت یہاں کے عظیم الشان مکانات تھے[۱] امراء کے مکانات ایک چوکور کی شکل میں ہوا کرتے تھے جن کے بیچ میں صحن ہوا کرتا تھا۔ سواری کا سب سے اہم ذریعہ گھوڑا تھا۔ اس زمانے میں "پہیئے" کا کوئی تصور نہیں تھا اس لئے انیسویں صدی تک پہیوں پر چلنے والی گاڑی سے ملتی جلتی کوئی چیز نہیں ملتی۔ البتہ

۱۔ بامزئی: ہسٹری آف کشمیر ص ۲۳۹

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

وقت میں کشتیوں کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر کیا جاتا تھا۔

ہندو دور میں عورتوں کی کافی اہمیت تھی۔ امیر طبقہ کی خواتین ہر طرح کی تعلیم و تربیت سے آراستہ تھیں۔ کھیمندر کے مطابق عورتیں پراکرت روانی سے بولتی تھیں[۱]۔ غریب طبقہ کی عورتیں مقامی بولی میں گفتگو کرتی تھیں۔ پردے کا کوئی رواج نہ تھا۔ عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی تھیں۔ گھر میں ہوں، میدان جنگ میں ہوں یا کھیتوں میں وہ مرد کا برابر ہاتھ بٹاتی تھیں۔ سماج میں انھیں عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ بیواؤں کی شادی کا رواج تھا۔ امراء کے طبقہ میں ستی کا رواج بھی تھا لیکن عام لوگ اس کے پابند نہ تھے راجا اور امراء ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ شادی کر سکتے تھے۔ سماج میں طوائفوں کا بھی ایک طبقہ تھا۔ مندروں کے ساتھ دیواسیوں کی خاصی تعداد موجود رہتی تھی۔ سیاست میں عورتوں کا کافی دخل تھا۔

۳ اسلامی عہد

چودھویں صدی عیسوی سے اسلامی عہد کی شروعات ہوتی ہیں۔ کلہن کے مطابق ہرش (گیارہویں صدی) کے زمانہ سے قبل لوگوں کے بال بڑھے ہوئے ملتے ہیں۔ اس لئے سر کو ڈھانپنا ضروری بنتا تھا۔ بامزئی کا خیال ہے کہ ہرش نے گندھارا اور پنجاب کے مغربی علاقوں کے اسلامی اثرات کے تحت پگڑی اور چھوٹے سائز کے کوٹ کو رواج دیا[۲] لیکن صوفیائے کرام اور اسلامی مفکرین کے آنے کے بعد کشمیریوں نے لمبے چوغے اور گول پگڑی کا استعمال سیکھا یہ لباس عام طور سے سوتی یا اونی کپڑے سے تیار ہوتا تھا۔ لیکن خاص خاص موقعوں پر

---

[۱] پی این کے بامزئی : ہسٹری آف کشمیر ص ۲۰۲

[۲] ایضاً ص ۵۱۱

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

امیر طبقہ کے لوگ ریشمی کپڑے کا استعمال بھی کرتے تھے۔ اس دور میں امراء کا لباس کم و بیش وہی تھا جو عرب، ایران اور ترکستان میں استعمال ہوتا تھا۔ محبّ الحسن کے مطابق اس طرح کے لباس کی شروعات سید علی ہمدانی رح نے سلطان قطب الدّین کے زمانے میں کرائی اور سلطان سکندر بت شکن کے زمانہ تک آتے آتے کشمیری برہمنوں نے بھی اسی لباس کو اپنانا شروع کیا تھا[۱] شلوار اور قمیض کے ساتھ ساتھ صدری پہننے کا رواج ہو گیا اس کے اوپر ایک چوغہ پہنا جاتا تھا۔ سر پر ایک ٹوپی ہوتی تھی جس پر پگڑی باندھی جاتی تھی۔ قاضی اور علماء سیاہ رنگ کی پگڑی استعمال کرتے تھے[۲]۔ غریب لوگ پاجامہ یا شلوار کی طرح کی کوئی چیز استعمال نہیں کرتے تھے البتہ ٹوپی ضرور استعمال کرتے تھے۔

اس دور کے آغاز میں جس طرح کے لمبے چوغے کا استعمال ہونے لگا اس نے بعد میں "پھرن" کی شکل اختیار کر لی۔ جسے آج تک کشمیری متاعِ عزیز سمجھتے ہیں۔ سماج کے مختلف طبقوں میں استعمال کئے جانے والے لباس میں کوئی یکسانیت نہ تھی۔ عورتوں کا لباس مردوں سے قدرے مختلف تھا۔ عورتوں میں پاجامہ پہننے کا رواج تھا لیکن ان کی ٹانگیں اکثر عریاں رہتی تھیں[۳] مسلمان عورتیں سر پر "کسابہ" اور پنڈت خواتین "ترنگہ" استعمال کرتی تھیں۔ مغلوں کے آنے کے بعد "پھرن" (جو[۴] بعض لوگوں کے مطابق پیراہن کی بگڑی ہوئی شکل ہے) کے استعمال پر اصرار ہوا اور کانگڑی کا استعمال بھی شد و مد سے ہونے لگا۔ تاکہ کشمیریوں کی شجاعت بوش

---

1. MOHIBUL HUSSAIN : KASHMIR UNDER THE SULTANS P. 228
2. — DO — — DO — — DO —
3. DR. R.K. PARMU : A HISTORY OF MUSLIM RULE IN KASHMIR PAGE 448
4. پھرن سنسکرت پیوارنہ کی بگڑی ہوئی شکل بتائی جاتی ہے۔ جو پیوارنہ سے پھورانہ اور پھر پھران بن گیا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اور دنولہ ختم کیا جائے[1] ہندوؤں اور مسلمانوں کے لباس میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ بدس کا یہ فرق شاہ جہاں کے عہد حکومت سے ہونے لگا[2] اس دور میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو اور مسلمانوں نے ہندوؤں کی تہذیب اور آداب زندگی کو متاثر کیا۔ اسلام کی آمد کے بعد اور تبدیلیٔ مذہب کے باوجود عام لوگ اپنے ماضی کو فراموش نہ کر سکے اس لئے مسلمان عہد میں عید الفطر اور عید الضحیٰ کے ساتھ ساتھ ہندو تیوہار بھی اسی شان و شوکت سے منائے جاتے تھے۔ ہندوؤں کے مقدس مقامات کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ مسلمان بعض اوقات مورتیوں کی پوجا بھی کرتے تھے[3] تواریخی شواہد سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ اکثر سلاطین بڑے روادار تھے اور ہندو تیوہاروں میں بڑے خلوص اور عقیدت کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ اکثر سلاطین نے ہندو عورتوں کے ساتھ شادیاں رچائی تھیں۔ جو نہ صرف اپنے پرانے عقائد پر کاربند تھیں بلکہ ان کے اثرات اپنے شوہروں اور بچوں پر واضح تھے اتنا ہی نہیں بلکہ مسلمانوں نے ہندوؤں کی بہت سی ضعیف الاعتقادیاں بھی حاصل کر لی تھیں۔ مثلاً "دُم دار تارے کو دیکھنا، کتے کے بھونکنے کو سننا، دن میں الو کا بولنا، سانپ کا راستہ کاٹ کر گزرنا وغیرہ تباہی کی علامات سمجھی جاتی تھیں[4]

کڑاکے کی سردی کے باعث لوگ بہت کم نہاتے تھے۔ اس بدعت کو ختم کرنے کے لئے مرزا حیدر دوغلت نے مسجدوں میں حمام کی شروعات کروائیں جہاں نہانے دھونے کے لئے گرم پانی مہیا ہوتا تھا[5] لوگ عام طور سے مفلوک الحال تھے۔ اس لئے

1۔ پی۔ این۔ کے بامزئی: ہسٹری آف کشمیر ص ۵۱۲

2۔ DR. R.K. PARMU: HISTORY OF MUSLIM RULE IN KASHMIR. P.448

3۔ 4۔ MOHIBUL HASSAN: KASHMIR UNDER THE SULTANS PAGE 240

5۔ بامزئی: ہسٹری آف کشمیر ص ۵۱۲

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ان کے پاس کپڑوں کی قلت رہا کرتی تھی۔ بامزئی نے تزک جہانگیری کے حوالے سے لکھا ہے:۔

"اپنے افلاس کے باعث کشمیری ایک سے زیادہ پھرن نہیں رکھ سکتے
اس کو صرف اسی وقت تبدیل کیا جاتا ہے جب یہ بالکل ناقابل
استعمال ہو جاتا ہے۔"[۱]

زیورات کا استعمال برابر ہوتا تھا۔ سلاطین اور مغلوں کے عہد میں زیورات کے ڈیزائن میں البتہ تبدیلی رونما ہوئی۔ صوفی نے زیورات کے ڈیزائن میں تبدیلی لانے کا سہرا ملکہ نور جہاں کے سر باندھا ہے[۲]۔ عام کشمیریوں نے مغل زیورات کی نقل کی۔

خوراک کی مد میں چاول کو اہمیت تھی جسے کئی طریقوں سے پکایا جاتا تھا۔ ایرانی اثرات کے تحت کئی طرح کے پلاؤ پکتے تھے جو امراء کا من پسند کھانا تھا۔ غریب لوگ گندم اور جو کا استعمال کرتے تھے۔ مچھلی، انڈے، گوشت اور سبزیوں کا رواج تھا۔ مغلوں نے گشتابہ کباب، روغن جوش کا اضافہ کیا۔ شراب کا استعمال ہوتا تھا۔ بھنگ اور افیم جیسی نشہ آور چیزیں بھی استعمال ہوتی تھیں۔ نمکین چائے اور قہوے کا رواج تھا۔ تفریح طبع کے لئے کئی مشاغل تھے۔ پولو کھیلنے کا عام رواج تھا۔ اس کو چوگان کہتے تھے اور غالب "گلگت" کے ساتھ تعلقات کی بنا پر اس کا رواج ہو چلا تھا۔ امراء شکار کے شوقین تھے۔ شکرے پرندوں کو آسمان کی بلندیوں سے مار گرا کر اپنے مالک کے پاس لے آتے تھے[۳]۔ شکاری حضرات جھیلوں کے کنارے کشتیوں میں بیٹھ کر یہ نظارہ دیکھتے تھے اور بہت پسند کرتے تھے۔ عام لوگ ہاکی کھیلتے تھے[۴]۔ دوسرا کھیل پتنگ سے متعلق تھا

---

[۱] بامزئی: ہسٹری آف کشمیر ص ۵۱۲
[۲] صوفی: کشمیر جلد دوم ص ۵۸۱
[۳،۴] MOHIBUL HASSAN : KASHMIR UNDER SULTANS PAGE 231-232

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

جمعہ کو سری نگر کے کسی بھی علاقے کے لوگ دوسرے علاقے کے لوگوں کو للکارتے تھے۔ جگہ اور اور وقت مقررہ پر لاٹھیاں چلتی تھیں۔ خوب سر پھٹول ہوتا تھا اور لوگ زخمی ہو جاتے تھے[1] شعبدہ بازی، تیر اندازی اور تیغ زنی کا بڑا چلن تھا۔ موسیقی کافی مقبول تھی بڈشاہ کے عہد میں خاص طور سے موسیقی کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ لوک گیتوں ڈراموں اور شعر و سخن کی مجلسیں ذوق و شوق سے منعقد ہوتی تھیں۔ 'بھانڈ پاتھر' کو بڑے شوق سے دیکھا جاتا تھا۔ بہادری دکھانے کے کرتب تو تھے ہی۔ اس لئے کشتی بازی ماہی گیری، کبوتر بازی، گھوڑ سواری، سانڈوں کی جنگ وغیرہ عام تھی۔ مقامی اثرات کی وجہ سے جشن غریب لوگ بھی مناتے تھے۔ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں دریائے جہلم میں 'تخت رواں' پر یا شالیمار و ویری ناگ اور اچھبل میں جشن مناتے تھے[2]

اس دور میں شاندار عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ لکڑی بافراط ملتی تھی۔ اس لئے مکانات عام طور پر لکڑی کے تعمیر ہوتے تھے اور مکانات چار چار پانچ پانچ منزلہ ہوا کرتے تھے چھتیں ڈھلوان دار ہوتی تھیں تاکہ برف پھسل کر آسانی سے نیچے گر سکے۔ بھوج پتر پر مٹی کی موٹی تہیں لگ جاتی تھیں۔ جن پر رنگ برنگ کے پھولوں کی بہار ہوتی۔ دیہاتی مکانوں کی چھتیں گھاس پھوس کی ہوتی تھیں۔ اچھے اچھے مکان عام طور سے دریا کے کنارے تعمیر ہوتے تھے۔

بار برداری میں خچر استعمال ہوتے تھے۔ بڑے بڑے مرغزاروں میں گھوڑے پالے جاتے تھے۔ بیگار کا رواج تھا۔ سب سے اہم سواری النسانی پیٹھ تھی[3] کشتی

---

1. MOHIBUL HASSAN: KASHMIR UNDER SULTANS PAGE 232

2. DR: R.K. PARMU: A HISTORY OF MUSLIM RULE IN KASHMIR P. 449

3. بامزئی: ہسٹری آف کشمیر ص ۵۱۹

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

رانی ہوتی تھی۔ اندرونی تجارت کے لئے کشتیاں استعمال ہوتی تھیں۔ عورتوں کا درجہ وہی تھا جو ہر ایسے سماج میں ہوتا ہے جہاں مردوں کی بالادستی ہوتی ہے۔ عورتیں عام طور سے گھروں میں رہتی تھیں البتہ غریب گھرانوں کی عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں۔ امیر گھرانوں میں عربی، فارسی اور دینی تعلیم کا رواج تھا۔ غریب عورتیں زیور علم سے عموماً آراستہ نہیں ہوتی تھیں۔ مرد ایک سے زیادہ شادیاں کر سکتا تھا۔ ہندو دور کے مقابلہ میں اس زمانے میں عیاشیوں کے مواقع کم تھے۔

سکھ عہد

کشمیر میں سکھ عہد صرف ۲۷ سال رہا اس عرصہ میں وہ عام طور پر فوجی کاروائیوں میں مصروف رہے اس لئے لوگوں کے معیار زندگی میں کوئی نمایاں تبدیلی رونما نہیں ہوئی لوگوں کا لباس اور ان کا رہن سہن بالکل معمولی قسم کا تھا۔ مرد اور عورتیں لمبا اور ڈھیلا ڈھالا پھیرن استعمال کرتی تھیں۔ لوگوں کی معاشی حالت ابتر تھی۔ افلاس کے مارے ہوئے لوگ اکثر پھٹے پرانے چیتھڑوں میں ملبوس نظر آتے تھے[1] طبقہ امراء بارسوخ سکھوں اور پنڈتوں پر مشتمل تھا جو عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ لوگ جب گھومنے پھرنے یا سیر کو چلے جاتے تو نوکروں کی پوری فوج دائیں بائیں رہتی سیر و سیاحت اکثر و بیشتر کشتیوں میں ہوتی تھی جن کو مردوں کے علاوہ خوبصورت عورتیں چلاتی تھیں۔ ان کی کلائیوں پر گھنگروں کی طرح کا کوئی زیور بندھا رہتا تھا۔ جو چپو چلاتے وقت مدھم آواز کا سنگیت جگاتا تھا۔[2]

---

[1] بامزئی: ہسٹری آف کشمیر ص ۶۳۷

[2] ایضاً

حسن کے مطابق اس سے قبل کے دور میں پٹھو کے دُرمے کا رواج تھا اور اس عہد میں معدوم ہو چکا تھا اور اس کے بجائے چادر کا رواج ہو چلا تھا۔ گرمیوں میں لیٹھے کی چادر استعمال ہوتی تھی [١]۔ پگڑی میں تبدیلی آ چکی تھی۔ بازہو کے مطابق ہندو اور مسلمانوں کے لباس میں شاہ جہاں کے عہد میں تبدیلی آ چکی تھی۔ حسن کا خیال ہے کہ دونوں فرقوں میں لباس کا کوئی فرق نہیں تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ پنڈتوں کا پھرن چوڑی دار اور اس کی آستینیں دراز تھیں۔ پاجامہ چست تھا۔ یہ لوگ ایک فٹ عرض والی بیس گز کی لمبی پگڑی باندھتے تھے۔ اس کے مقابلے میں ایک یا دو حصہ والی پٹو یا پشمینہ کی چادر استعمال ہوتی تھی [٢]۔ کشمیری پنڈتوں کا عام پیشہ منشی گری تھا۔ اس لئے ان کی کمر میں ایک "لونگی" بندھی رہتی تھی جس کے ساتھ قلمدان بندھا رہتا تھا۔ عام پنڈتوں کی حالت مسلمانوں ہی کی طرح ناگفتہ بہ تھی۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے۔

> "وہ شادی اپنے کپڑوں کو تبدیل کرتا تھا۔ یہ کوئی اچھنبے کی بات نہیں تھی کہ یہ دو ایک دن کی چھٹی کی درخواست دیتا تھا۔ جو اس کے حق میں منظور ہوتی تھی تاکہ وہ اپنے پھرن اور پگڑی کو دھو سکے۔" [٣]

متوسط طبقہ کے لوگ چاول، گوشت، مچھلی اور سبز ترکاری کھاتے تھے۔ عام لوگوں کی معاشی حالت ابتر تھی۔ وہ سنگھاڑے اور ندرو کھا کر گذارہ کرتے تھے۔ بامزئی نے مورکرافٹ کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس دور میں تقریباً تیس ہزار لوگ پانچ ماہ

---

[١] حسن کھویہامی: تاریخ حسن حصہ اول ۵۳ھ

[٢] ایضاً

[٣] پی۔ این۔ کے بامزئی: ہسٹری آف کشمیر ص ٦٣٨

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تک سنگھاڑہ اور پانچ ہزار افراد آٹھ ماہ تک صرف ندرو کھاتے تھے[1]۔ مکانات کھنڈر ہو چکے تھے۔ تعمیر و ترقی کی طرف کوئی دھیان نہیں تھا۔ بیشتر لوگ بھیک مانگتے تھے۔ کسانوں کی حالت مزید ناگفتہ بہ تھی۔ وہ ریاست سے باہر جا کر مزدوری کرتے تھے اور "ہانو" کہلاتے تھے۔ کار بیگار بالا کا سلسلہ جو قدیم وقتوں سے چلا آرہا تھا، اب تک قائم تھا[2] لیکن اس کا بوجھ شہریوں کے بجائے دیہاتی لوگوں کو زیادہ برداشت کرنا پڑتا تھا۔ عورتوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ گھر گرہستی کے علاوہ ان کا کام چرخہ کاتنا بھی تھا۔ افلاس کے مارے ہوئے لوگ اپنے بچوں کو فروخت کرتے تھے[3]۔

ڈوگرہ عہد

ڈوگرہ عہد میں بھی عورتوں اور مردوں کے لباس میں بہت کم فرق تھا۔ پھرن کا رواج حسب معمول تھا۔ مرد پگڑی باندھتے تھے۔ فیشن پرست لوگ پگڑی کو اپنے سر کے پچھلے حصے پر اس طرح باندھتے تھے کہ پیشانی کا خاصا حصہ کھلا رہتا تھا۔ عورتیں لمبا پھرن پہنتی تھیں۔ مسلمان خواتین کا پھرن نسبتاً کم لمبا ہوا کرتا تھا۔ کنواری اور بیاہتا عورتوں کے پھرن ایک دوسرے سے مختلف ہوتے تھے۔ بیاہتا پنڈت خواتین کے پھرن کے دامن اور گردن کے کناروں پر ایک بورڈر لگا تھا جسے "ڈور" کہا جاتا تھا۔ آستین کھلی اور چوڑی ہوتی تھی۔ سہاگن پنڈتانی کے پھرن کی آستین پر

---

[1] پی۔ این۔ کے بامزئی : ہسٹری آف کشمیر ص ۶۳۸

[2] R. K. PARIMU : A HISTORY OF SIKH RULE IN KASHMIR P. 308

[3] P. 308

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ایک پاٹسٹر استعمال ہوتا تھا جسے "ژرجار" کہا جاتا تھا۔ بیوہ ہو جانے پر "نرواز" ہٹا دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد عام طور سے وہ رنگین کپڑے کا استعمال بھی نہیں کرتی تھی۔ پھرن کی جیب بائیں طرف ہوتی تھی۔ مردوں اور مسلمان خواتین کے پھرن کی جیب دائیں طرف ہوتی تھی۔ ترنگہ اور کسابہ کا رواج تھا۔ پنڈتانیوں کے ترنگہ کے ساتھ ایک ڈوپٹے کا استعمال لازمی تھا جسے "لوش" کہا جاتا تھا۔ یہ "لوژ" کچھ اس طرح استعمال ہوتی تھی کہ اس کا جو حصہ سر پہ رہتا تھا وہ ایک پھن پھیلائے ہوئے سانپ کے مانند ہوتا تھا۔ قیاس غالب ہے کہ لباس کا یہ طرز بہت قدیم ہے اور اپنے اندر ناگ اثرات لئے ہوئے ہے۔ پھرن پر پنڈتانیاں ایک کمر بند باندھتی تھیں جسے "لونگی" کہا جاتا تھا۔

گھر کے باہر کشمیری پنڈت خواتین اپنے سر اور چہرے کے نصف حصے کو ایک باریک ڈوپٹے سے چھپا لیتی تھیں اور سردیوں میں موٹا اونی یا رفل کا کپڑا استعمال ہوتا تھا جسے "ذرپو" کہا جاتا تھا۔ ساڑھی کا رواج بیسویں صدی کے تیسرے دہے میں ہوا۔ جب جہیز کے خلاف مہم چلائی گئی اور "لونگ پوژ" مردہ باد کا نعرہ بلند ہوا۔ کشمیری پنڈت خواتین زیورات میں علاوہ دوسری چیزوں کے "ڈیجہ ہور" کا استعمال کرتی تھیں جو کان سے ایک دھاگے یا سونے کی زنجیر سے لٹکا رہتا تھا۔ یہ شادی شدہ عورت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اور اب تک برابر اس کا استعمال ہوتا ہے۔ بالوں کو ایک خاص ڈھنگ سے سنوارا جاتا تھا۔ کنوارپنے میں لڑکیاں بالوں کی چھوٹی چھوٹی مینڈھیاں گوندھتی تھیں۔ شادی کے بعد بالوں کے سٹائل میں نمایاں تبدیلی آجاتی تھی ان مینڈھیوں کو کھول کر ایک بڑی چوٹی میں گوندھ دیا جاتا تھا امیر گھرانوں کی خواتین بموقع استعمال کرتی تھیں اور اس میں ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ سفر کے دوران پٹو یا اونی کپڑے کو ٹانگوں کے گرد چستی سے لپیٹ لیا جاتا تھا جسے "عجت" کہا جاتا تھا۔ پاؤں کے چمڑے کا خالص جوتا استعمال ہوتا تھا جسے "پانار"

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کہا جاتا تھا جس کے تلوے میں میخیں لگی تھیں۔ "پازار" کو پائیدار بنانے کے لئے تیل کی مالش کی جاتی تھی۔ چمڑے کے جوتے صرف اُمراء استعمال کرتے تھے۔ غریب لوگ گھاس کے پولے استعمال کرتے تھے جن کو "پُل ہور" کہا جاتا تھا۔ لکڑی کے کھڑاؤں عام طور سے استعمال ہوتے تھے۔

لارنس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملبوسات کے فرق کے بارے میں بڑی دلچسپ باتیں لکھی ہیں۔ چند باتیں ملاحظہ ہوں:-

"پنڈت اپنی سفید پگڑی کو دائیں طرف کے کونے سے اور مسلمان بائیں طرف کے کونے سے باندھتا ہے۔ پنڈت اپنے پھرن کو دائیں اور مسلمان بائیں طرف باندھتا ہے۔ پنڈتوں کے پھرن کی آستین لمبی اور تنگ ہوتی ہے اور مسلمانوں کی چھوٹی ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے امتیاز کرنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے کیونکہ مسلمان ہمیشہ گھوڑوں پہ پیچھے سے سوار ہوتے ہیں اور ہندو آگے سے۔"[1]

اس دور میں پگڑیوں کے مختلف انداز سے باندھے جانے کی تصدیق بیٹس کے مرتب کردہ گزٹ سے بھی ہوتی ہے۔[2] مختلف پیشہ وارانہ طبقوں میں پگڑیوں کے مختلف انداز نظر آتے ہیں۔ ٹنڈل بسکو نے ڈوگرہ شاہی کے زمانہ میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کشمیر میں گزارا اور کشمیر کی سماجی زندگی میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اپنی کتاب "کشمیر ان سن لائٹ اینڈ شیڈ" میں کشمیر سے متعلق اپنی یادداشتوں کو اس نے قلم

---

[1] والٹر لارنس: ویلی آف کشمیر ص ۲۵۳

[2] CHARLES ELLISON BATES: A GEZETTE OF KASHMIR PAGE 35

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

منڈ بنا ہے۔ اُس کے مطابق برہمن کی پگڑی میں چونکہ وزن زیادہ ہوتا ہے اس لئے وہ زیادہ بھاری بھر کم ہوتی ہے اور اس کے مقابلے میں ایک ترکھان یا ایک ماجی کی پگڑی ڈھیلی ڈھالی ہوتی ہے اور اس کی ہیبت بھی مختلف ہوتی ہے۔[1] لیکن بسکو کے ایسے بیانات میں خلوص کا فقدان ہے۔ اور اُن کی اکثر تحریروں سے کشمیریوں سے متعلق تضحیک کا پہلو نکلتا ہے۔ مثال کے طور پر پھیرن کے بارے میں موصوف رقمطراز ہے:

"کہا جاتا ہے کہ جب افغانوں نے کشمیر کو فتح کیا تب انھوں نے مردوں کو مجبور کیا کہ وہ عورتوں کے مانند لباس پہن لیں کیونکہ یہ ان کے کردار کے عین مطابق ہے"[2]

بسکو نے کشمیری پگڑی کی بہت سی خصوصیات گنوائی ہیں۔ مثلاً یہ کہ یہ سر کا تحفظ کرتی ہے اور سر پر کیا ہوا کوئی بھی وار کارگر نہیں ہوتا۔ یہ گرمیوں میں سر کو سرد اور سردیوں میں گرم رکھتی ہے۔ اس سے درخت پر چڑھنے کے لئے رسی کا کام لیا جاتا ہے اور گھوڑ سواری کے وقت تیز رفتار گھوڑے کو روکا جا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مسلمان کھلا پاجامہ پہنتے تھے اور کشمیری پنڈت تنگ اور چست پاجامہ استعمال کرتے تھے جسے چکنے کاغذ کی مدد سے پہنا جاتا تھا۔

لارنس کے مطابق رات اور دن کو اس زمانہ میں تیس تیس حصوں میں بانٹا گیا تھا[3] لوگ نصف شب کو جاگ اٹھتے تھے اور دیئے کی دھیمی لو میں اپنا جسم کا کاج شروع کرتے تھے۔ عورتیں چرخا کاتتی تھیں۔ دھان کوٹتی تھیں اور گھر گرہستی کا کام کرتی تھیں۔

---

[1] C. E. TYNDALE BISCOE : KASHMIR IN SUNLIGHT & SHADE P. 138

[2] - DO - PAGE 138, 139

[3] والٹر لارنس - ویلی آف کشمیر ص ۲۵۳

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دیہاتوں میں گھریلو دستکاریوں کا رواج تھا۔ خوراک میں کوئی نمایاں فرق نہیں تھا۔ مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی چائے کا رواج بڑھ گیا تھا۔ مسلمان نمکین چائے اور پنڈت عام طور سے قہوہ پیتے تھے۔ دیہاتوں میں نمکین چائے کا رواج ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں تھا۔ نسوار اور تمباکو نوشی کا استعمال عام تھا۔

زمانہ نے کروٹ بدلی۔ سائنس کی محیر العقل ایجادات نے دنیا کے جغرافیہ کو بدل دیا ہے۔ ریاست سے باہر یا سمندر پار کے ممالک کی سیاحت، کاروبار اور لین دین نے کشمیریوں کے لباس رہن سہن اور آداب زندگی میں حیرت انگیز تبدیلیاں رونما کی ہیں۔ زمانہ حال میں دیسی اور بدیسی دونوں طرح کے لباس اور طرز زندگی کا چلن ہے۔ مرد کوٹ پتلون، ٹائی، شیروانی، کھلا پاجامہ، گاندھی ٹوپی، جناح اور افغان کٹ کی ٹوپی، کھدر کا کرتہ شلوار اور قمیض، خان ڈریس، بیل باٹم، گون، تہمد غرض ہر طرح کا لباس استعمال کرتے ہیں۔ کمر کی چادر جلواری میں سردیوں کے موسم میں اب بھی کانگڑی اور پھرن محبوب اور مقبول ہیں۔ پگڑیاں اپنے جملہ اقسام کے ساتھ غائب ہوتی جا رہی ہیں۔ عورتوں میں پھرن کا رواج اب بھی ہے مگر قدرے کم۔ ترنگہ، کسابہ اور قرابہ معدوم اور قصۂ پارینہ بنتا جا رہا ہے۔ اس کی جگہ ساڑھی، شلوار، قمیض اور میکسی نے لے لی ہے۔ برقعے کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے۔

مکانات کے ڈیزائن بدل گئے ہیں۔ لوگ اب کالونیوں کی پُر سکون اور کٹی ہوئی زندگی پسند کرنے لگ گئے ہیں۔ لوگوں میں نفاست پسندی اور مغربیت کے اثرات پیدا ہو گئے ہیں۔ مکانات چھوٹے اور بڑے دونوں طرح کے تعمیر ہونے لگے ہیں تانگے کا رواج کم ہو گیا ہے۔ بسوں، کاروں اور سکوٹروں نے ان کی جگہ لی ہے۔ لوگوں کے تفریحی مشاغل بدل گئے ہیں۔ گلی ڈنڈا، کبڈی اور "سنز لونگ" کی جگہ کرکٹ، ہاکی، ٹینس، بیڈمنٹن

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

نے لے لی ہے۔ ٹیلی ویژن، ریڈیو اور سینما نے مذاق بدل دیئے ہیں۔ چھتوں کے لالہ زار کے
بدلے ... ویژن کے ان ٹینا کی بہار ہے۔ بجلی کے لیمپ اور ٹیوب لائٹ نے مٹی کے دیئے
کی مدھم لو ختم کر دی ہے۔ چرخے کی جگہ سلائی کی مشین لے رہی ہے۔ نمکین چائے اور
قہوہ کے ذائقہ کی جگہ کافی اور لپٹن کی چائے کی خوشبو پسند کی جاتی ہے۔ گائے کے
تھنوں سے اُبلے ہوئے گرم دودھ کے بدلے پوڈر اور کنڈنسڈ دودھ آنے لگا ہے۔
کاوڈارہ اور لتہ پورہ کا ساگ اب ایک خواب ہے۔ گرُس، سدر کانز، چھپہ کہ دود، واہ نج
اور کبنہ لوب، کا کوئی تصور آج کے کشمیری بچوں کو نہیں ہے۔ اور اس طرح صدیوں پرانی
زندگی، لباس، رہن سہن اور آداب زندگی یکسر تبدیل ہو گئے ہیں۔ اور نئے باب کا
آغاز ہوا ہے۔ کون جانے آنے والا وقت ہماری طرزِ زندگی میں کون سی بہار لے آئے

●●

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

آثارِ قدیمہ

ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے دور صدیوں پرانے دُھندلکے نظر آتے ہیں
ٹوٹے چھوٹے پتھروں اور اینٹوں پر سے منوں مٹی، گھاس اور کائی کی صدیوں پرانی
سنگلاخ تہیں کھرچ کھرچ کر ایک نئی دنیا کی بازیافت ہوتی ہے۔ تلاش اور جستجو کی ازلی
پیاس نے انسان کو کہاں کہاں پہنچا دیا ہے۔ غاروں اور گپھاؤں کے صنم کدوں، پتھر
کی مورتیوں، اینٹوں اور ٹائیلوں پر کندہ نقوش، عبادت گاہوں کے خستہ حال در و دیوار
باغوں کی ٹوٹی پھوٹی بارہ دریوں کے حقیقی اسرار کو سمجھنے کے لئے انسان نے اپنے ذوقِ
جستجو کو رہنما بنایا ہے اور اس نے ان سناٹوں اور تنہائیوں کے پس پشت ان
پراسرار نغموں، ان کے تقدس، ان کی معنی خیز آہٹوں کو پہچاننے کی کوشش کی
ہے۔ جو ان ٹوٹے پھوٹے در و دیوار اور بام و سقف سے لپٹی ہوئی ہیں۔ انسان
کی اسی مسلسل کد و کاوش نے اُسے صدیوں پرانی تہذیبوں کی دہلیز پر پہنچا دیا ہے
جہاں صدیوں کی دیواریں ڈھ جاتی ہیں۔ زماں و مکاں کا بُعد ٹوٹ جاتا ہے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اور انسان کا رشتہ قدیم ترین انسان سے قائم ہوتا ہے۔

کشمیر نے ستی سر جھیل کی نیلا ہٹوں سے لے کر آج تک کتنے روپ بدلے ہیں۔ انسانی جغرافیہ اور انسانی تواریخ کی کتنی جہتیں جستہ جستہ اُبھری ہیں۔ ان کو سمجھانے میں پرانے مسودات اور کھنڈرات کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ انسان کی گذشتہ عظمتوں، بادشاہوں کی بصیرت اور ذوق و شوق، معماروں کی کاریگری اور ان گنت بے نام ذہنوں کے خونِ جگر کی نمود پتھروں اور مٹی پر منقش شبیہ کاری اور حُسن کاری سے ہوتا ہے۔ آثار قدیمہ کے بصیرت افروز علم نے صدیوں کی تاریکیوں میں چراغ روشن کئے ہیں اور یہ بات واضح کی ہے کہ کشمیر کے قدیم کھنڈرات ہندوستان کی قدیم تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ پنڈت آنند کول بامزئی اپنی قابل قدر تصنیف (ARCHAEOLOGICAL REMAINS OF KASHMIR) کے مقدمے میں ڈاکٹر نیو کے حوالے سے لکھتے ہیں :-

"قدیم ہندوستان کی ابتدائی تہذیب میں کشمیر کے شاندار کھنڈرات سے زیادہ قابل ذکر کھنڈرات نہیں ہیں۔ یہ کھنڈرات کشمیر کے لئے باعث افتخار اور سیاحوں کے لئے قابل تحسین ہیں فن تعمیر کے اعتبار سے شاندار اور پُرشکوہ عمارتیں ہندوستان کے مختلف حصّوں میں ہوں تو ہوں لیکن متناسب حدوں تک عظیم اور پُرشکوہ قدیم عمارتیں کشمیر کے سوا اور کہیں نہیں ملتیں۔"

ماہرین آثار قدیمہ اس بات پر متفق ہیں کہ عیسوی صدی سے ماقبل کسی قابل ذکر عمارت کے نشان نہیں ملتے۔ حتیٰ کہ عیسیٰ کی ابتدائی چھ صدیوں کے دوران بھی کوئی قابل ذکر عمارت نظر نہیں آتی۔ اس دوران صرف برزہ ہامہ کی گڈھوں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

والی رہائش گاہیں قابل ذکر ہیں جن کا ذکر آگے ہوگا یا پھر بودھ دھرم سے متعلق وہ عمارتیں ہیں جو ہاروان اور اُوشکر میں ملی ہیں اور جن کا تعلق کشان عہد سے ہے۔ پنڈت آر۔سی۔ کاک اپنی تصنیف میں رقمطراز ہیں:-

"کنشک کے انتقال کے بعد بھی گاندھارا کی سلطنت کے ساتھ برابر تعلقات قایم رہے۔ شمال مغرب کے ساتھ ہندوستان کے ان تعلقات نے وادی کے بودھ اور ہند و فن تعمیر پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس زمانے کی بودھ عمارتوں میں طرز تعمیر وہی ہے جو گاندھارا کی عمارتوں کا طرہ امتیاز ہے۔ البتہ خام مواد اور تزئین کاری کے معاملے میں تھوڑا سا فرق محسوس ہے۔" ۱

کشمیر میں جگہ جگہ کھنڈرات ملتے ہیں۔ مندر، مسجدیں، بودھ وہار، اینٹوں اور پتھروں پر منقش حسن کاری، برتن، ہتھیار، آلات اور ظروف اور ایسی ہی اَن گنت چیزیں انسانی ذہن کے دریچے کھول دیتی ہیں۔ برزہ ہامہ، ہاروان، مارتنڈ، پرہاس پور، لوُمہ زو، ہاری پربت، مدین صاحب، جامع مسجد، مسجد اخون ملاشاہ، پری محل، مغل باغات اور ایسی ہی لاتعداد جگہوں کے کھنڈرات کئی سچائیوں پر سے پردے سرکاتے ہیں۔ یہ ایک لمبی اور دل چسپ داستان ہے۔ یہاں ہم صرف چند اہم کھنڈرات کا ذکر کرتے ہیں۔

برزہ ہامہ

سرینگر سے کوئی پندرہ کلومیٹر دور برزہ ہامہ نام کا ایک گاؤں ہے حالیہ

۱. R.C. KAK: ANCIENT MONUMENTS OF KASHMIR —— P.50

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

برسوں کے دوران اس کی کھدائی سے کچھ نئی باتوں کا انکشاف ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے
کہ یہاں "پتھروں کے زمانے" کی تہذیب پروان چڑھی تھی۔ یہاں کے قدیم لوگ گڈھوں
میں رہائش کرتے تھے یہ گڈھے کریوہ کی بلندی پر کھودے گئے تھے ان رہائش گاہوں کی
بنیاد زمین عام طور سے گول یا بیضوی شکل کی ہے۔ اور وہانے تنگ و تاریک ان پر
گیلی مٹی کا پلاسٹر چڑھایا جاتا تھا۔ بعض گڈھوں میں زینے بھی ملے ہیں اور بعض میں ایک
دوسرے سے ملانے والے زمین دوز راستے بھی۔ آر سی رے کے مطابق ان گڈھوں پر
پھوس کی چھتیں تھیں۔ وہ بعض چولھوں اور اناج جمع کرنے والے گڈھوں کی موجودگی سے
یہ نتیجہ بھی اخذ کرتے ہیں کہ ان گڈھوں کے مکیں گرمیوں میں گڈھوں سے باہر آ کر رہتے
تھے۔ یہاں پر کھدائی کی دوسری منزل سے کئی اور باتوں کا پتہ چلا ہے اور لوگوں کی
تہذیبی زندگی کی کئی نئی منزلیں دریافت ہوئی ہیں۔ اب ایسی رہائش گاہوں کے
نشان ملتے ہیں جو اینٹوں سے بنے ہوتے ہیں۔ ابتدائی دور کے گڈھے بھر دیئے گئے
ہیں۔ مٹی کے برتن اب مقابلتاً بہتر ہیں اور واضح طور پر ایک ارتقائی منزل کا احساس
ہوتا ہے۔ تیسری منزل کی کھدائی کچھ بہتر باتوں کا سراغ دیتی ہے۔ خاص طور پر
مٹی کے برتن چاک سے بنائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ برزہامہ سے متعلق "پتھروں
کے زمانہ" کی تہذیب ۲۳۰۰ - ۱۵۰۰ قبل مسیح کے درمیان پروان چڑھی
اس زمانہ کی تیسری منزل کے نقوش دوسری اور تیسری صدی عیسوی تک ملتے ہیں۔[1]
یہاں کھدائی کے دوران کچھ قبروں کے آثار ملے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ
اس زمانہ میں مردوں کو دفن کرنے کا رواج تھا۔

---

1. DR. S. R. RAY: EARLY HISTORY AND CULTURE OF KASHMIR P. 113

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہاروَن

سر آرل سٹائین نے ہاروَن کو زمانہ قدیم کا شڈار ہارڈون (سداردون) کہا ہے۔ جو "چھ رشیوں کا کنج" تھا۔ اس جگہ کا ذکر راج ترنگنی میں بھی آیا ہے۔ ہاروَن میں کچھ کھنڈرات ملے ہیں جو اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ یہاں کسی زمانے میں مندر موجود تھے۔ لیکن کسی مورتی کا پتہ نہیں چلتا۔ مندر کے کھنڈرات کے ساتھ کچھ ٹائلیں دستیاب ہوئی ہیں جو مختلف صورتوں اور نمونوں کی ہیں ان پر فن کاری کے بعض عمدہ نمونے منقش نظر آتے ہیں۔ ان میں کچھ پھول پتے، ڈل میں پلنے جانے والے آبی پودے، کنول اور تو اور بطخوں، ہرنوں اور مرغوں کی تصویریں، رقص کرنے والی عورتوں کی شبیہ، گلدان تھامے ہوئے دوشیزائیں بڑی خوبصورتی اور نفاست سے کندہ کی ہوئی ملتی ہیں۔ ان ٹائلیوں پر کھروشتی رسم خط میں بعض اعداد بھی نظر آتے ہیں۔ ہر ٹائیل اپنے عدد کے اعتبار سے ترتیب دی گئی ہے۔ آر، سی، کاک کے مطابق کھروشتی اعداد کی موجودگی سے ان ٹائیلوں کی تاریخ آسانی سے متعین ہو سکتی ہے۔ کھروشتی رسم خط کا چلن شمال مغربی ہندوستان میں پانچویں صدی عیسوی کے بعد نہیں تھا اس لئے ٹائیلوں اور کنکروں والی معماری کی تاریخ تیسری صدی عیسوی ہو سکتی ہے۔[1] جن ٹائیلوں کا ذکر اوپر ہوا ان کے بارے میں ایک خاص بات یہ سمجھا ہے کہ ان پر جو شبیہیں بنی ہوئی ہیں وہ آج کل کے انسانوں جیسی نہیں بلکہ لباس اور وضع قطع سے یہ لوگ کاشغر اور یارقند سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ

---

1. R.C. KAK ; ANCIENT MONUMENTS OF KASHMIR P 110

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہ اس زمانہ کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں جب کشان بادشاہوں کے ہاتھوں میں یہاں کی عنان سلطنت تھی اور یہ دور یقینی طور پر بدھ دور ہے۔ ہاروَن کی عمارتیں کنشک کے نام سے منسوب کی جاتی ہیں جن کا تعلق پہلی صدی عیسوی سے ہے کنشک نے اسی زمانہ میں کشمیر میں ایک بودھ کونسل کا اہتمام کیا تھا اور گمان غالب ہے کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں یہ مجلس منعقد ہوئی تھی بودھ عالم ناگ ارجن کا مستقر بھی یہی مقام بتایا جاتا ہے۔ ہاروَن کی ٹائیلوں کی ایک خاص خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس قسم کی ٹائلیں دنیا میں اور کہیں دستیاب نہیں ہوتیں۔ شروع شروع میں صرف کنکروں سے عمارتیں تعمیر ہوتی تھیں ان کے کھنڈرات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تیسری صدی عیسوی میں تعمیر ہوئی تھیں۔ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی کے درمیان تعمیر ہوئی عمارتوں کے کھنڈرات سے معلوم ہوتا ہے کہ کاریگر عمارتوں کو مضبوط بنانے کے لئے کنکروں کے درمیان پتھر بھی ڈال دیتے تھے۔

مارتنڈ

کشمیر کے قدیم مندروں کے کھنڈرات میں مارتنڈ جلال و جمال کی خوبصورت مثال ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس کا خوب صورت محل وقوع ہے۔ چونے کے پتھروں سے بنا ہوا یہ مندر موجودہ مٹن (اننت ناگ) کے نزدیک ایک کرلوہ پر تعمیر کیا گیا تھا۔ مندر کی تعمیر میں کتنے بڑے اور سنگلاخ پتھر استعمال ہوئے ہیں یہ بات بذات خود باعث حیرت ہے کہ زمانہ قدیم میں کشمیر کے لوگ جبر ثقیل کے علم کی ان عظمتوں سے واقف تھے جن سے بڑے سے بڑے پتھر کافی بلندیوں پر پہنچائے جاتے تھے۔ کلہن نے راج ترنگنی میں اس بات کی طرف واضح اشارہ کیا ہے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اس مندر کے کھنڈر بقول ینگ ہسبنڈ مغربی اور یونانی مندروں کی شان رکھتے ہیں کننگھم ان پر یونانی آرٹ کے گہرے اثرات کا ذکر کرتا ہے۔ آر سی کاک ان مندروں پر بودھ فن تعمیر کا ذکر کرتے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ کشمیر کے تمام مندروں سے یہ مندر ہے۔ زیادہ تکمیل کو پہنچا ہوا مندر ہے۔ آنند کول بامزئی کے مطابق مرکزی عمارت ۶۳ فٹ لمبی اور ۳۶ فٹ چوڑی ہے۔ سامنے کی طرف ایک پوجا کی جگہ ہے جو ستونوں کی اس قطار سے بلند ہے جس پر مندر تعمیر ہے۔ فن تعمیر کے اس عظیم الشان نمونے کی تاریخ تعمیر کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ گمان غالب ہے کہ اس کی بنیاد ۳۷۰ - ۵۰۰ء کے دوران ڈالی گئی۔ راج ترنگنی کے مطابق ستونوں کی قطار مہاراجہ للتہ دیتہ نے (۷۰۱ - ۷۵۷ء) بنوائی تھی۔ اور اس کی ابتدائی تعمیر راجہ رانا دیتہ (۲۲۳ء) کے زمانہ میں ہوئی اور اس کی دوسری ملحقہ عمارتیں اس کی رانی امرت پربھا نے تعمیر کروائی تھیں۔ بعض عالموں کا خیال ہے کہ یہ سوریہ مندر ہے لیکن فرگوسن اس خیال کی تردید کرتے ہوئے اس کی تعمیر اونتی پورہ کے مندر کے سو سال بعد قرار دیتا ہے۔ کننگھم کے مطابق یہ اصل میں سوریہ مندر ہی ہے۔ وہ اس کی وجہ تعمیر یہ بتاتا ہے کہ اس کا محل وقوع دھوپ کی فضا کے لئے مناسب تھا۔ مندر کے اندر جانے کے لئے اب تک تین دروازے موجود ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ مندر کے اندر جانے کے لئے سیڑھیاں بنی تھیں۔ اندر تری مورتی کا اوپر والا نصف مجسمہ موجود تھا۔

شنکر آچاریہ کا مندر

شنکر آچاریہ کا مندر کشمیر کا بہت اہم اور قابل دید مندر ہے جھیل ڈل

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کے کنارے سرینگر شہر کے جنوب مشرق میں شنکر آچاریہ پہاڑی پر ایک خوبصورت مندر ہے۔ یہ سطح سمندر سے سوا چھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ راج ترنگنی میں اس پہاڑی کو گوپادری کہا گیا ہے۔ ابوالفضل اسے کوہ سلیمان کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ اس مندر کی تاریخ تعمیر خاصی متنازعہ فیہ رہی ہے۔ جنرل کننگھم اور لفٹیننٹ کول کے مطابق اس مندر کو مہاراجہ اشوک کے بیٹے جلوکا نے ۲۲۰ ق م کے دوران تعمیر کروایا تھا۔ کلہن اسے راجا گوپادیتہ (۳۸۸ - ۳۶۸ ق م) کی تعمیر قرار دیتا ہے لیکن ماہرین آثار قدیمہ ان باتوں سے متفق نظر نہیں آتے۔ ایک اور انگریز مورخ فرگوسن اس کی تعمیر کسی نامعلوم ہندو کے نام سے منسوب کرتا ہے جس نے اسے شو کی پوجا کے لئے مغل شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں بنوایا تھا اور جس کی مزید تعمیر اورنگ زیب کے پہلے سال جلوس میں ہو گئی تھی۔ لیکن کئی دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مندر قرون وسطی کا ہے جب اس طرح کی دوسری عمارتیں مثلاً پٹن کے مندر تعمیر ہوئے تھے۔ گمان غالب ہے کہ جیشٹھ رودر کا مندر بھی اسی جگہ واقع تھا۔ مندر کے سامنے اسلامی فن تعمیر کے دو ایک کھنڈر بھی ملتے ہیں جو شاہ جہاں کے عہد کے بتائے جاتے ہیں۔ اور ماگھ کی پورنماشی کو ہر سال یہاں میلہ لگتا ہے اور ہزاروں عقیدت مند اس مندر میں درشنوں کے لئے چلے آتے ہیں۔

پاندریٹھن

پاندریٹھن کی تاریخ قدیم ہے۔ یہ پُران ادھشٹان کی بگڑی ہوئی صورت ہے جس کے معنی پرانے شہر کے ہیں۔ پران ادھشٹان سری نگری کے نام سے مہاراجہ اشوک نے تیسری صدی عیسوی میں بسایا تھا۔ لیکن کوئی آٹھ سو سال بعد

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پرواسین دوئم نے اپنی راج دہانی دریائے جہلم کے کنارے موجودہ سرینگر کے قریب آباد کیا۔ اور اسے سرینگر کا نام دیا۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ مہاراجہ اشوک کی سری نگری کا نام بھی اب کوئی نہیں جانتا۔ بہرحال یہی پرانا شہر پُران ادھشتان یا پاندریٹھن ہے۔ یہاں عہد قدیم کا مندر ہے جو ایک ۴۰ فٹ مربع تالاب پر تعمیر کیا گیا ہے۔ بعض تواریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ مندر قدیم ہے اور راجہ ابھیمنو کے عہد حکومت کے دوران جب سارا شہر جل کر خاکستر ہو گیا تو صرف یہی ایک مندر اس کی دست برد سے بچ گیا۔[۱] لیکن جنرل کننگھم اور لیفٹیننٹ کول اس بات پر متفق ہیں کہ یہ مندر وشنو مروار دھان سوامی کا مندر ہے اور اسے میرو وردھن نے تعمیر کروایا تھا۔ حتمی طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ آیا یہ ہندو مندر ہے یا بودھ مندر لیکن اس کے نام سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مندر ہندو عقیدے سے تعلق رکھتا ہے۔

اونتی پورہ

سری نگر جموں قومی شاہراہ پر سری نگر سے کوئی ۳۰ کلو میٹر دور راجا اونتی ورمن (۸۵۵-۸۸۳ء) کا بسایا ہوا شہر اونتی پورہ ہے۔ جو اس کی راجدھانی بھی تھا۔ اب اس جگہ کی اہمیت صرف ان کھنڈرات کے باعث ہے جو دو مندروں کی صورت میں شدائد زمانہ کا مقابلہ کرتے ہوئے اب تک موجود ہیں ایک مندر شو سوامن مندر ہے اور دوسرا اونتی سوامن وشنو مندر ہے۔ ان مندروں کے کھڑے اور گرے ہوئے دیوہیکل پتھر مندروں کے جلال کے ضامن ہیں۔ کشمیر آنے والا کوئی بھی سیلانی ان مندروں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ پتھروں پر منقش شبیہ کاری جلال کے ساتھ ساتھ ان کے جمال

---

[۱] [illegible] کھنڈرات (سون ادب ۱۹۷۷ء ص ۲۸)

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کی آئینہ دار ہیں۔ دونوں مندروں کے درمیان تقریباً آدھ میل کا فاصلہ ہے۔

پرہاس پورہ

پرہاس پور یا پرہاس پور موجودہ شادی پور سے کوئی چار کلو میٹر دور جنوب مغرب میں واقع ہے یہ شہر مہاراجہ للتہ دیتہ مکتاپیڈ نے اپنی راجدھانی کے طور پر آباد کیا تھا۔ اس شہر کے کھنڈرات میلوں تک پھیلے ہوئے ملتے ہیں۔ للتہ دیتہ نے بڑی عمارتیں، مندر اور وہار تعمیر کروائے تھے، ان میں خاص طور پر وہ پانچ مندر مشہور تھے جن کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ مکتا کیشو مندر میں وشنو کی سونے کی مورتی تھی۔ پرہاس کیشو میں چاندی کی مورتی اور مہادیو کے مندر میں سونے کے ہتھیاروں سے مزین مورتی تھی۔ اس کے علاوہ گووردھن وہار میں چاندی کی مورتی تھی۔ راج وہار بودھوں کا وہار تھا۔ جس میں مہاتما بدھ کا بڑا مجسمہ تھا۔ پرہاس پور میں دریائے سندھ اور وتستا کا سنگم ہونے کے باعث اس کی بڑی اہمیت تھی۔ مہاراجہ اونتی ورمن کے عہد میں دیلئے نے جہلم کا رخ موڑے جانے کے باعث یہ سنگم موجودہ شادی پورہ میں بن گیا اور پرہاس پور کی شان اور اس کی اہمیت ختم ہو گئی۔ لبعد میں یہ شہر سکندر بت شکن کے ہاتھوں تاراج ہوا۔

اندرکوٹ

موجودہ شادی پور سے کوئی سات آٹھ کلو میٹر دور راجا جے پیڈ نے (۷۵۳ - ۷۸۴ء) اپنی راجدھانی جے پیڈ پور میں بنوائی تھی۔ جسے آج اندر کوٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں چند پرانے مندروں کے کھنڈرات ملتے ہیں۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بیجبہاڑا

بیجبہاڑا ہندوؤں کا قدیم تیرتھ وجیشور ہے۔ جسے راجا وجیلا نے تعمیر کروایا تھا۔ یہاں کسی زمانے میں شیو وجیشور کا مقدس استھاپن تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ اشوک نے یہاں ایک بدھ وہار تعمیر کروایا تھا۔ یہاں بہت سے کھنڈرات بکھرے ہوئے ہیں۔

پٹن کے کھنڈرات

پٹن میں سڑک کے کنارے دو قدیم مندر ملتے ہیں۔ یہ مندر فن تعمیر کے اعتبار سے مارتنڈ کے مندروں سے ملتے جلتے ہیں۔ ایک مندر اونتی ورمن کے بیٹے راجہ شنکر ورمن (۸۸۳ - ۸۹۰ء) نے اور دوسرا اس کی رانی سوگندھا نے تعمیر کروایا تھا۔ ان مندروں کے کھنڈرات میں کاریگروں کے اعلےٰ نمونے دستیاب ہوئے ہیں۔ پٹن کے قریب ہی ایک کریوہ کے دامن میں تاپر میں ایک اور مندر کے کھنڈرات ملتے ہیں۔ شنکر ورمن نے للتا دیتہ کے بسائے ہوئے شہر پریہاس پورہ کے مندروں سے قیمتی ساز و سامان اٹھا کر شنکر پورہ (پٹن) کو آباد کیا تھا۔ تاپر کا مندر پرتاپ پیڈا دوئیم کی رانی نرندر پربھا کے نام سے منسوب ہے۔ پرتاپ پیڈا کا عہد حکومت ۶۳۴ - ۶۸۴ء ہے۔

بارہمولہ سے کوئی ۱۸ کلومیٹر دور بونیار واقع ہے۔ یہاں کا مندر تباہی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سے بچ گیا ہے۔ یہ مندر سنگ سخت سے بنا ہوا ہے۔ جس کی کان دریائے جہلم کے بائیں کنارے پر اب بھی موجود ہے۔ مندر کی تاریخ تعمیر کا کوئی انداز نہیں ہوتا۔ کننگھم کا خیال ہے کہ لونیار کا نام بھوانی پور رہا ہوگا۔ اور بھوانی ماں کے نام سے منسوب رہا ہوگا۔

ناراں ناگ

ناراں ناگ وانگت کے قریب واقع ہے۔ یہ کشمیر میں ہندوؤں کا مشہور تیرتھ استھان ہے یہاں ایک بڑے چشمے کے آس پاس کئی مندروں کے کھنڈرات ہیں جن کی تعمیر قرون وسطیٰ کی بتائی جاتی ہے۔ اصل میں یہاں مندروں کے دو حلقے ہیں۔ وانگت کے نزدیک پہلے حلقے میں چھ مندروں کے کھنڈرات ہیں جن کے ارد گرد ایک دیوار ہے۔ ناراں ناگ کا قدیم نام سدا تیرتھ ہے۔

زینہ لنک

جھیل ولر کشمیر کی سب سے بڑی جھیل ہے۔ اس کا قدیم نام "مہا پدم سر" بتایا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں کسی زمانے میں ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا۔ جس پر ایک مندر تعمیر کیا تھا۔ انقلاب زمانہ نے اس مندر کو منہدم کیا۔ بڈشاہ نے اس جزیرے کو وسعت دیکر ایک مسجد اور ایک جھونپڑی بنوائی تھی۔ اب صرف کھنڈر ہی کھنڈر رہ ہیں۔ آر سی کاک کا خیال ہے کہ مندر جس کے کھنڈرات اب بھی ملتے ہیں غالباً بڈشاہ نے ہی تعمیر کروایا تھا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اوشکر

اوشکر کی کھدائی نے کئی نئی باتیں سامنے لائی ہیں۔ یہاں سے سنگ تراشی کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں وہ اپنی طرز کے اولین نمونے بتلائے جاتے ہیں۔ یہاں کی مورتی گری پر گندھارہ کی فن سنگ تراشی کے اثرات ملتے ہیں۔ یہاں ایک ستوپا پایا گیا ہے جس کے ارد گرد ایک دیوار ہے۔ اوشکر بارہ مولہ کے قریب ہے۔ ہیون سانگ یہاں سے ہو کر ہی وادی میں داخل ہوا تھا۔ اس دور میں کشمیر میں کئی ستوپ اور بودھ وہار موجود تھے۔ خود اوشکر کے مقام ایک بڑا بودھ وہار تھا جہاں بہت سے بودھ بھکشو قیام پذیر تھے۔ بودھوں کے وہار اور عبادت گاہیں پاندریٹھن، پریہاس پور، کانس پور، ہاردن، سرینگر اور دوسرے مقامات پر موجود تھے۔ شاید زمانہ نے ان کو مٹا کر رکھ دیا ہے اور ان کے ہلکے نقوش کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔

اسلامی فنِ تعمیر

کشمیر میں اسلامی عہد کا آغاز چودھویں صدی عیسوی میں ہوا۔ سب سے پہلا مسلمان بادشاہ رینچن شاہ (۱۳۲۰ - ۱۳۲۳ء) تھا۔ جس نے اسلام قبول کر کے اسلامی حکومت کا پہلا پتھر رکھا۔ لیکن صحیح معنوں میں سلطان شمس الدین شاہ میر (۱۳۳۹ - ۱۳۴۲ء) کے عہد سے اسلامی حکومت کا آغاز ہوتا ہے۔ رینچن شاہ (سلطان صدر الدین) نے حضرت شرف الدین بلبل شاہ کے ہاتھوں اسلام قبول کیا تھا۔ چناں چہ ان کے نام پر سرینگر کی پہلی مسجد بلبل لنگر (نواکدل) میں تعمیر ہوئی۔ پرانی خانقاہ آگ کی ایک واردات میں جل گئی اس کی جگہ نئی خانقاہ تعمیر ہوئی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

رنچن شاہ نے اپنے نام سے ایک اور مسجد موجودہ عالی کدل میں تعمیر کرائی جو آج تک شکستہ حالی کی صورت میں موجود ہے۔ خود رنچن شاہ کا مقبرہ بلبل لنکر کی ایک گلی میں موجود ہے اور زمانہ کے بے رحم ہاتھوں پر خندہ زن ہے۔

اسلامی دور میں شروع شروع میں ہندو اور بودھ مت کے منہدم مندروں کے مسالے سے عمارتیں بنوائی گئیں۔ چنانچہ ایسی کئی مثالیں مدین صاحب کی مسجد یا اس کے گرد و نواح کے کھنڈرات یا زین العابدین کی مسجد یا پھر جھیل ولر پر تعمیر کی ہوئی مسجدیں ملتی ہیں۔ بڈشاہ کی والدہ کا مقبرہ اصل میں کوئی ہندو یا بودھ عبادت گاہ بتائی جاتی ہے اسی طرح شاہ ہمدان کی خانقاہ ایک قدیم عمارت ہے اور حضرت میر سید علی ہمدانی رح کے نام پر تعمیر ہوئی ہے۔ بڈشاہ کی والدہ کے مقبرے کا ذکر کرتے ہوئے فرگوسن نے لکھا ہے کہ اس کی دیوار اسلامی عہد کی ہے لیکن اس کا مسالہ ہندو تعمیرات سے لیا گیا ہے۔ اور ان پر ہندو تبرکات کی شبیہ کاری اس کا واضح ثبوت ہے۔

جامع مسجد

کشمیر کی اس عظیم الشان مسجد کی تعمیر کو سکندر بت شکن (۱۳۹۰-۱۴۱۵ء) سے منسوب کیا جاتا ہے۔ تواریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ سکندر کے بیٹے زین العابدین نے اس کے حسن میں اضافہ کیا۔ ۱۴۷۹ء کی آتش زدگی کی واردات میں یہ مسجد خاکستر ہوئی۔ اس کے بعد یہ مسجد کئی بار جلی اور از سر نو تعمیر ہوئی اس مسجد کے مشرقی دروازے سے ایک نہر داخل ہو کر صحن کے بڑے تالاب کو سیراب کرتی تھی جسے زین گنگا کہتے تھے اور جسے بڈشاہ نے تعمیر کروایا تھا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اب یہ ہنر معدوم ہو چکی ہے۔ سکھ دور میں ۲۱ سال تک یہ عظیم مسجد بند رہی۔ ۲۱ سال کے بعد سکھ گورنر غلام محی الدین نے اسے کھلوایا تھا۔ جامع مسجد آج بھی زمانے کے سرد و گرم سہتی ہوئی سرینگر شہر کے بیچ پُر وقار انداز میں سر اُٹھائے کھڑی ہے۔

اخون مُلا شاہ کی مسجد

سلطان العارفین حضرت شیخ حمزہ مخدوم رح کی زیارت عالیہ سے ذرا نیچے ایک عظیم الشان مسجد کے کھنڈرات ملتے ہیں۔ یہ مسجد شاہجہاں کے بیٹے شہزادہ داراشکوہ نے جو ولی عہد تھا، اپنے اُستاد اخون مُلا شاہ کے لئے بنوائی تھی اس مسجد کی محراب نما نشست گاہیں اس کے درو دیوار مغل فن تعمیر کی عظمت آشکار کرتی ہیں۔ آج یہ عالی شان مسجد ایک کھنڈر کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

ہاری پربت کی فصیل

اکبر اعظم جب تیسری بار کشمیر آیا تو اس نے ہاری پربت پہاڑی کے ارد گرد ایک فصیل تعمیر کروائی۔ اس کے ساتھ ایک قلعہ تھا جو قلعہ سنگین دروازہ یا قلعہ نگر کہلاتا تھا۔ یہ فصیل بڑی مضبوط ہے اور تقریباً ۵۰ فٹ اوسطاً چوڑی ہے اس فصیل کے اندر ایک شہر آباد تھا۔ جہاں اُمرا اور روسائے کے باغات اور محلات تعمیر ہوئے تھے۔ شہر میں داخلے کے لئے اصل دروازہ کاٹھی دروازہ تھا۔ لارنس کے مطابق یہ قلعہ حکموں کے مظالم سے بھاگے ہوئے کشمیریوں کو وطن واپس کھینچنے کا وسیلہ تھا۔ مردوں اور عورتوں کو اس قلعے کی تعمیر

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کے کام کے لئے خاص رقم بطور اجرت دی جاتی تھی۔ پہاڑی پر جو قلعہ تعمیر ہوا ہے وہ افغان صوبیدار عطا محمد خان نے بنوایا تھا۔ یہ فصیل اور یہ قلعہ اب جگہ جگہ منہدم ہو چکا ہے۔

باغات

کشمیر خود ایک بڑا باغ ہے لیکن اچھے اور خوب صورت باغات سے اطراف کو سنوارنے کی روایت ہمارے یہاں زمانہ قدیم سے ملتی ہے اگرچہ بڈشاہ نے بھی اس طرف توجہ دی تھی لیکن اصل میں مغلوں نے باغوں کے حسن کو ساری وادی میں بکھیر دیا۔ لارنس کا خیال ہے کہ مغل دور میں جھیل ڈل کے گرد و نواح میں ۷۷ باغات تھے[1] نشاط، شالیمار، چشمہ شاہی، چار چنار ویری ناگ، اچھہ بل کے باغات اب بھی اسی شان دلربائی سے جلوہ فگن ہیں۔ لیکن چودھری باغ، الٰہی باغ، عیش باغ، باغ ظفر شاہ، باغ بہار آرا، باغ دلاور خان، کوٹھی باغ، رام باغ، دیوان باغ، باغ سوکھ رام، باغ علی مردان، باغ جہاں آرا، دارا محل اور ایسے ہزاروں باغ اب معدوم ہو چکے ہیں اور ان کے نام اب تاریخ کے پارینہ اوراق میں موجود ہیں۔ زمانے کے سفاک ہاتھوں نے ان باغوں کی خوشبو مٹا دی ہے۔

پری محل

چشمہ شاہی کے پاس ہی زبرون پہاڑی کی بلندی پر اس باغ کے آثار اب بھی ملتے ہیں اور اب اس کی مرمت ہوتی رہتی ہے۔ جس سے اس کے نقوش محفوظ ہو گئے ہیں قیاس غالب ہے کہ یہاں بھی فوارے موجود تھے۔ جن میں زمین دوز نہروں سے پانی آتا تھا۔ پورا باغ چھ طبقوں میں منقسم تھا۔ اوپر والے طبقے میں اب تک وہ کھنڈرات ملتے ہیں۔ پہاڑ کی طرف سے پانی آتا تھا۔ یہ دارا شکوہ کی رصد گاہ تھی جہاں ستاروں

(1) WALTER LAWRANCE: THE VALLEY OF KASHMIR PAGE 125

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کی گردش کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ یہاں ایک لائبریری بھی ہوا کرتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اسے
داراشکوہ نے اپنے استاد ملا اخون شاہ کے لئے بنوایا تھا۔

یہ اور اس طرح کے مقامات، مندر اور وہار، مسجدیں اور خانقاہیں کشمیر کے چپے
چپے میں کھنڈروں اور دھندلے نقوش کی صورت میں ملتے ہیں جن کا احاطہ کرنا اس مختصر
سے مضمون میں ناممکن ہے۔ لیکن جن کے یہ دھندلے دھندلے نقوش زبان حال سے اپنی
گذشتہ عظمتوں کے گواہ ہیں اور ان کو فراموش کرنا اپنی تہذیب کو، اپنے وجود کو فراموش
کرنے کے مترادف ہوگا۔ آنے والی نسلیں ان کو یاد کر کے دل مسوس کر اٹھیں گی کون جو

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

شہرِ لالہ و گُل

کشمیر کی جنت کا جب بھی خیال کیجئے تو شری نگر کی من موہنی تصویر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے۔ شری نگر کا صدیوں پرانا شہر آج اپنی رنگا رنگ تہذیب؍ روایات کے کھنڈر گود میں سنبھالے اُسی تب و تاب اور شانِ دل نوازی کیساتھ کھڑا نظر آتا ہے جیسا بیتی ہوئی صدیوں کے ان مختلف زمانوں میں تھا جب مختلف عقاید کے لوگوں نے اسے اپنے اپنے طور سنگار کیا تھا۔ اس شہر کے سینے میں کتنے خواب دفن ہیں اور اسکی آنکھوں میں یادوں کے کتنے گھاؤ رِس رہے ہیں کون جانے!

ہندو مہاراجوں کے وقت میں گونجتی ہوئی شنکھ کی سریلی آوازیں، بودھ کلچر کا "بدھم گچھمنم سرنامے" اسلام کی توحیدی صدائیں، افغانوں اور مغلوں کا حُسن اور جمالیاتی شعور، سکھوں اور ڈوگروں کی دلاوری — یہ سب اب بھی یہاں کے پتھروں دروں اور دیواروں، باغوں اور پیڑوں کی جھومتی ہوئی ڈالوں اور یہاں کی کومل دھرتی کے پھولوں میں مسکرا رہا ہے۔ وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اگرچہ ان نقوش کو پھیکا کر دیا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہے لیکن یہ نقش لازوال ہیں اور اب بھی وقت کے بیکراں وجود کو چیرتے ہوئے صدیوں پرانی یادیں زندہ کرتے ہیں۔

شری نگر جو اب سری نگر کہلاتا ہے ان چند شہروں میں سے ایک ہے جن کو صدیوں سے راج دہانیاں بنے رہنے کا فخر حاصل ہے اور جو وقت کے شدائد کا مقابلہ کرنے کے باوجود زندہ ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ لگ بھگ دو ہزار برس قبل مہاراجہ اشوک نے اس شہر کی بنیاد ڈالی تھی اور اس شہر کا نام "دیوی مہا لکشمی" (دھن اور دولت کی دیوی) کے مقدس نام پر شری نگر رکھا گیا تھا۔ شری کے معنی ہیں لکشمی کے جو خوشحالی کی دیوی ہے اور نگری کے معنی شہر کے ہیں اس رعایت سے یہ شہر خوش بختی کا شہر کہلایا۔ اس زمانے میں یہ شہر موجودہ شہر کے آس پاس شنکر اچاریہ کی پہاڑی کے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر جنوب کی طرف پھیلا ہوا تھا جسے کلہن "پران ادھشٹان" کہتا ہے اور آج کل پاندریٹھن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

تواریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ شری نگر کا یہ نام بعد میں بادشاہ پرواسین دوئم کی راجدھانی پرواپور کے لئے مخصوص ہو گیا۔ پرواسین کا بنایا ہوا شہر تو اب تک قایم ہے لیکن وقت کی ستم ظریفی نے اس شہر سے اس کا اصلی نام یعنی پرواپورہ چھین لیا اور اس کے بجائے اشوک اعظم کے شہرت یافتہ شہر کا نام چسپاں کر دیا۔ چناں چہ پرواپورہ کے بعد یہ شہر شری نگر ہی کہلایا البتہ مسلمان حکمرانوں نے اپنی حکومت کے دوران سرینگر کے نام کو بدل کر اسے پورے ملک کا نام دیا اور عرصۂ دراز تک سرینگر کو کشمیر ہی کہا جاتا رہا۔ کشمیر اور لداخ کے گزیٹیر میں جو ہندوستان کے کوارٹر ماسٹر جنرل انٹیلی جنس برانچ) کی نگرانی میں تیار کیا گیا تھا۔ اس بات کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

"ہم دیکھتے ہیں کہ اورنگ زیب کے زمانے میں برنیئر اور فوسٹر جو
اس ملک کا دورہ ۱۷۸۳ء میں کرتے رہے سرینگر کے بجائے "کشمیر"
کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ سکھوں نے اپنی فتح کے بعد پرانا ہندو نام اس شہر
سے استعمال کیا۔" ؎۱

کشمیر کے بارے میں چینی سیاح ہیون سانگ کی تفصیل غالباً اولین تواریخی دستاویز ہے
وہ ۶۳۱ء کے دوران کشمیر آیا تھا اور یہاں دو سال قیام کیا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق
اس زمانے میں کشمیر کی راجدھانی ایک دریا کے کنارے آباد تھی۔ کلہن کے مترجم اور مشہور
سنسکرت کے عالم سر ارل سٹین نے ہیون سانگ کی اس تفصیل کا ذکر کرتے ہوئے
لکھا ہے :۔

"وہ اسے (راجدھانی کو) ایک بڑے دریا یعنی وتستا کے کنارے آباد
بتاتا ہے جو شمال سے جنوب کی جانب ۱۲ یا ۱۳ لی لمبا اور مشرق سے
مغرب کی طرف ۴ یا ۵ لی چوڑا ہے۔ لی ایک چینی ناپ ہے ڈھائی
میل کا فاصلہ جو چینی ناپ کے ۱۲ یا ۱۳ لی سے ظاہر کیا گیا ہے۔ وہ
وتستا کے دائیں کنارے کے ساتھ شہر کی پرانی حدود کے ساتھ عین
مطابقت رکھتا ہے۔ اسی طرح اس کی چوڑائی جو ایک میل سے کم ہے
(۴ یا ۵ لی) بھی بالکل صحیح ہے۔" ؎۲

؎۱ GAZETTEER OF KASHMIR & LADAKH" COMPILLED UNDER THE DIRECTION OF THE QUARTER MASTER GENERAL IN INDIA IN THE INTELLIGENCE BRANCH (1890) P. 770

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

؎۲ راج ترنگنی (جلد دوم) مترجمہ ارل اسٹین

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہیون سانگ کے زمانے میں یہ شہر جو اس زمانے میں سرینگر نہیں کہلاتا تھا ولستا کے کنارے آباد تھا۔ ارل سٹین کے مطابق جنرل کینگھم[۲] نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ ہیون سانگ کے زمانے میں کشمیر کی راجدھانی در حقیقت موجودہ سرینگر تھا۔ ارل سٹین رقم طراز ہیں:۔

"جنرل کنیہگم نے اخذ کیا ہے کہ پرانی راجدھانی جو "پران اودھشٹان" کی جگہ پر واقع تھی حقیقت میں قدیم شہری نگر تھی جو کلہن نے اشوک اعظم کی بنائی ہوئی راجدھانی لکھا ہے۔"[۲]

ارل سٹین نے ہیون سانگ کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس کے وقت کا دارالخلافہ ہی دراصل موجودہ سرینگر ہے لکھتے ہیں:۔

"اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہیون سانگ کے وقت کی راجدھانی جو آج کے سرینگر سے مطابقت رکھتی ہے مقابلتاً نئی بنیاد تھی۔ ...... اس طرح پرانے شہر کا جو حوالہ ملتا ہے اس سے ہم اس کی پہلی راجدھانی کی حدود مقرر کر سکتے ہیں جو اشوک کی سرینگر آج کا پاندریٹھن یا کلہن کا "پران اودھشٹان" ہو سکتا ہے۔"[۳]

بامزئی نے اپنی تاریخ کشمیر میں ہیون سانگ کے تذکرے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے ہاں راجدھانی کے جس شہر کا ذکر کیا گیا ہے وہ پرواپور ہی ہے لکھتے ہیں:۔

---

[۱] الیگزنڈر کینیگھم ۱۸۴۷ء میں کشمیر میں ڈوگرہ شاہی کے قائم ہونے کے بعد وادی میں سیاسی مشن پر بھیج دیئے گئے۔
[۲] راج ترنگنی (جلد دویم) ترجمہ اسٹین صفحہ ۴۴۰
[۳] راج ترنگنی صفحہ ۳۵۷۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

"اس کے علاوہ راجدھانی شہر کے بارے میں بھی واضح بیان ملتا

ہے اس کو پو۔لو۔آن۔لو۔پولو PO - LO - ON - LO - PO - LO

کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جو پرو الپور کا صحیح REPRODUCTION

ہے۔ یہ وہ نام ہے جس سے اس زمانے میں سرینگر کو موسوم کیا

جاتا تھا"۔ [1]

کلہن اور تواریخ کشمیر کے دوسرے مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ موجودہ سرینگر کا

اصلی نام پرو الپور یا پرواراس تر تھا اور اس کی بنیاد کشمیر کے مشہور بادشاہ پرواسین

دویم [2] نے چھٹی صدی کے دوسرے نصف میں ڈالی جیسا کہ اوپر کہا گیا یہ شہر ہیون

سانگ کے کشمیر آنے سے پہلے آباد ہو چکا تھا۔ ہیون سانگ بھی اشوک اعظم کے

پران ادھشٹان کے مقابلے میں اس شہر کو "نیا شہر" [3] کہتا ہے جس سے سا

ہوتا ہے کہ یہ شہر ہیون سانگ کے زمانے میں نیا نیا آباد ہو چکا تھا۔ کلہن کی راج ترنگنی

میں اس نئے شہر کے آباد ہونے کا ذکر بڑا دلچسپ ہے۔ ارل سٹین کے مطابق کلہن

کی کہانی (اس شہر کے بارے میں) راج ترنگنی کے ۳۳۶ - ۳۳۹ (تیسرا حصہ) کے

اشلوکوں میں ملتی ہے۔ اس بات کے باوجود کہ ساری کہانی روایت کے طلسم میں لپٹی ہے

اس میں شہر سے متعلق جو بیان ملتا ہے وہ بڑا دلچسپ اور واضح ہے۔ کلہن نے

---

[1] ہسٹری آف کشمیر ۲۳

[2] پرواسین دویم ہو کر ماترگپت کی وفات اور ماترگپت کی تخت کی دستبرداری کے بعد کشمیر کا حکمران ہوا۔ وہ ایک بہادر بادشاہ اور پاک نفس آدمی تھا۔ اس نے ساٹھ سال حکومت کی۔ اپنے بزرگوں کی کھوئی ہوئی سلطنت حاصل کرنے کے بعد اسے اپنے نام پر ایک نیا شہر آباد کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس خواہش کی تکمیل میں اسے بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور آخر اس کی تمنا بر آئی۔ [3] ہسٹری آف کشمیر ۸۳

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

راج ترنگنی میں جو کہانی لکھی ہے وہ کچھ یوں ہے ۔ جب راجہ پرواسین دوئم اپنی فتوحات
کے بعد واپس لوٹا تو اس کی بڑی خواہش ہوئی کہ وہ یادگار کے طور پر ایک شہر آباد کرے
کافی عرصے تک وہ شہر کے لئے مناسب جگہ کا انتخاب نہ کر سکا۔ تب اُس نے کسی فوق الفطری
طریقے سے جگہ تلاش کرنے کی ٹھان لی۔ گھپ اندھیری رات تھی۔ راجہ اپنے محل سے
اکیلا ہی چل پڑا۔ کافی مسافت کے بعد اُسے ایک جگہ نظر آئی غور کرنے پر معلوم ہوا کہ
دریا کے کنارے شمشان گھاٹ ہے جہاں چتائیں جل رہی ہیں۔ رات کے بھیانک اندھیرے میں
دور دور تک شمشان گھاٹ کی آگ سے ہیبت ناک سائے نظر آتے تھے۔ راجا نے جب
چاروں طرف دیکھا تو دریا کے دوسرے کنارے کے قریب ایک بے حد ڈراونی صورت
نظر آئی۔ یہ قد و قامت کے لحاظ سے عام انسانی صورت نہیں تھی۔ اُس نے راجہ کو
دعوت دی کہ اگر وہ اس کے پاس چلا آئے گا تو نہ صرف یہ کہ اُسکو اپنے تمام سوالوں
کا جواب ملے گا بلکہ اُس کی تمام مشکلیں حل ہوں گی۔ نڈر راجا نے اپنے ہوش و حواس کو
قابو میں رکھتے ہوئے کہا کہ وہ دریا کو کس طرح پار کر سکتا ہے۔ اس دیو پیکر صورت نے
اپنی ٹانگ پھیلا کر دریا پر پُل سا بنایا۔ قیصر مگر نڈر راجا نے اپنی کھڑکی دیو کی ٹانگ میں
پیوست کرتے ہوئے دریا کو پار کر لیا اور اس دیو ہیکل کے قریب آگیا۔ اُس نے اپنا
تعارف کراتے ہوئے راجا سے کہا کہ وہ بھگوان شو کا غلام ویتال بھیرو ہے اور وکرمادتیہ
اور ستادھر کے بعد وہ یعنی پرواسین تیسرا شجاع بادشاہ ہے جس کی بہادری سے وہ
بے حد متاثر ہے۔ چنانچہ ویتال بھیرو نے نہ صرف راجا کے شہر کی نشاندہی کی بلکہ
اشیرواد دے کر مہورت کا وقت بھی بتا دیا۔ دوسرے دن راجا بھیرو کی بتائی ہوئی جگہ پر
یہ جگہ ہاری پربت کے ملحق تھی۔ راجہ نے شبھ مہورت پر ملک بھر کے پاک نفس اور
روحانیت میں دخل رکھنے والے مہاتماؤں کی موجودگی میں اپنے شہر کی بنیاد ڈالی۔ نئے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

شہر کی تعمیر اور آرائش کا کام وقت کے سب سے بڑے انجینئر بھیک کے سپرد ہوا۔ شہر کے مرکز میں بھگوان شبھو کا ایک مندر تعمیر کروایا جو کافی دنوں تک SIKADRAYARESYERA[1] کے نام سے مشہور رہا۔ کچھ عرصے کے بعد ہاری پربت کے ارد گرد عالی شان عمارتوں اور باغوں کے شہر آباد ہوا۔ اپنے اس شہر کو آفتوں سے بچانے کیلئے راجا نے نہ صرف اپنے وقت کے روحانی باکمالوں کی دعائیں حاصل کیں بلکہ مختلف مراکز پر پانچ عظیم الشان مندر تعمیر کروائے اور اس طرح سے سرینگر کا یہ پرانا شہر جو وقت کے بے رحم تھپیڑوں کے باوجود کھڑا نظر آتا ہے آج سے کوئی تیرہ سو سال پہلے دھرتی کے سینے پر نمودار ہوا راجہ پرواسین نے اپنے نام کو زندہ رکھنے کیلئے اس شہر کو بسایا تھا۔ لیکن وقت نے اپنے سنگدل ہاتھوں سے پرواسین کا دیا ہوا نام پرواپور مٹا دیا اور اسے اشوک اعظم کے شہر کے نام سے ہی زندہ جاوید رکھنا مناسب سمجھا۔

اس بات سے قطع نظر کہ ہیون سانگ کے زمانہ قیام میں سرینگر کس شکل و صورت میں کھڑا تھا یہ بات اہم ہے کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر جنوب سے شمال کی طرف پھیلا ہوا تھا۔ وتستا اس کو کاٹتی ہوئی گذر جاتی تھی۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ شہر ندی کے دوسرے کنارے پر بھی آباد ہو گیا اور آج صدیاں گذرنے کے بعد شہر کی حدود میں وسعتیں پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔ وتستا ایک خوبصورت ناگن کی طرح اپنے نیلے پانیوں کے چمکتے ہوئے جسم کو سمیٹتی تھکے قدموں کے ساتھ بہتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا صدیوں پہلے شروع ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے چہرے پر تھکان یا ملال کے سائے نظر نہیں آتے۔ سرینگر کے ایک طرف ڈل جھیل ہے جس کے

۱۔ "راج ترنگنی" حصہ دوئم مترجم اسٹین صفحہ ۴۳۹

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کنارے پر پہاڑوں کی بانہوں میں کھلے ہوئے مغلوں کے باغات ہیں جو اپنے رنگوں کی بہار اور چناروں کے ٹھنڈے سائے سے اسمیں حسن اور رنگ کی جھالر تان دیتے ہیں شنکر آچاریہ کی پہاڑی، ہاری پربت کا قلعہ، ہندوؤں کے مندر، مسلمانوں کی مسجدیں سکھوں کے گوردوارے، زیارتگاہیں اور آستھاپن، بادام کے شگوفے اور کنول کے پھول، تیرتے ہوئے باغات، ہوس بوٹ اور شکارے اس شہر نگاراں میں قوس قزح کے رنگ بھر دیتے ہیں۔ دوسری طرف آنچار کا دودھیلا پانی ہے جس کی خوبصورتی اپنی جگہ پر مسلم ہے۔

وتستا

ولستا، ویتھ یا جہلم۔ تان اسی خوبصورت دریا پر ٹوٹتی ہے جس سے سرینگر کی آن بان قائم ہے۔ شہر کے بیچ میں بہتا ہوا صدیوں پرانا دریا ہندو دیومالا میں ایک تیرتھ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہ دریا ہے جس کے پانیوں میں ہندوؤں کے اعتقاد کے مطابق ڈبکی لگانے سے پاپیوں کے پاپ دھل جاتے ہیں۔ جہلم کا اصلی نام ویتھ ہے جو سنسکرت کے وتستا سے ماخوذ ہے اور رفتار زمانہ کے ساتھ لسانی تبدیلیوں کے بعد "ویتھ" بن گیا ہے۔ وتستا کا لفظ رگ وید کے دریائی ناموں میں بھی نظر آتا ہے۔ یونانیوں نے اسے ہائیڈسپس HYDESPES [1] کے نام سے موسوم کیا ہے۔ بعض سنسکرت بولنے والے اسے وستا بھی لکھتے آئے ہیں۔ حیرانی کی بات ہے کہ آٹھویں صدی کی چینی تواریخوں میں بھی یہی نام ملتا ہے۔ نیل مت پران

---

[1] گزیٹر آف کشمیر اینڈ لداخ صفحہ ۴۰۵

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

میں کاشمیر (کشمیر) کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے وتستا کو ہمالیہ کی بیٹی اور مہان دیوی بنایا گیا ہے[1] قدیم کشمیر سے متعلق اس قدیم انیسکلوپیڈیا میں بتایا گیا ہے کہ وتستا شو کی محبوبہ پاروتی کا مظہر ہے قدیم روایات کا ذکر کرتے ہوئے اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ پشاچوں کے ساتھ میل جول کے نتیجے میں ناگ قوم کے لوگ اپنی ذات کھو بیٹھے تھے اور بہت پریشان تھے۔ انکی پاکیزگی کو برقرار رکھنے کیلئے انہیں پرائشچت کرنے کی ضرورت تھی لہذا کشپ رشی نے بھگوان شو کی اپاسنا کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ دیوی کو پانی کی شکل میں بھیج دیں۔ پاروتی دیوی اپنے مالک کے حکم کے مطابق پانی کی شکل میں ڈھل کر دھرتی کے ایسے حصے میں میں آگئیں اور زمین کے اندر پناہ لی اور بھگوان شو سے درخواست کی کہ وہ انکو زمین سے باہر نکال لیں چنانچہ بھگوان نے اپنے ترشول کو نیل ناگ کے نزدیک زمین میں گاڑ دیا جس سے ایک وتاسی (VATASI) یا بالشت کے برابر پانی باہر پھٹ آیا اور اس رعایت سے یہ ندی وتستا کہلائی اس سلسلے میں نیل مت پران میں لکھا ہے:-

”کشمیر کو اسطرح آباد دیکھ کر کشپ نے شنکر کی پوجا کی اور دیوی اُما کو آمادہ کیا کہ اس ملک کو پانی کے تحفے سے پوتر کر دے اور وہ جو پاپوں کو زائل کرنے والی ہے۔ دریائے وتستا کے نام سے مشہور رہے“[2]

شنکر کی خواہش کے مطابق دیوی نے پانی کی صورت اختیار کر لی اور اپنے مالک

۱۔ نیل مت پران حصہ دوئم مرتبہ ڈاکٹر وید کماری گئی ۲۰
۲۔ نیل مت پران حصہ دوئم مرتبہ ڈاکٹر وید کماری گئی ۲۱

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سے یوں کہنے لگی :۔

اے سنسار کے مالک میں پاتال (نیچے کی دنیا) میں ایک صورت اختیار کر لوں گی تب آپ نیل کے قریب اپنا ترشول زمین میں گاڑ دیجیے۔ ترشول گڑھنے سے میں پاتال سے باہر نکل آؤنگی اور اس راستے پر چلونگی جو اس نیل سے اس جگہ تک بنا ہے جہاں بڑا دریا سندھ ہے۔ شنکر نے خود اس کا نام وتستا رکھا کیونکہ ہر نے ترشول سے ایک گڑھا بنا لیا تھا جو وتاسی کی ناپ کا تھا۔ اس سے ہی پیاچھی ندی جو کہ پاتال میں جا چکی تھی باہر آئی۔ اس لئے اس کا نام شمبو نے خود وتستا رکھا۔ ا ے

چشمے کی وہ جگہ جہاں سے پاروتی کا جلوہ ندی کی صورت میں نمودار ہوا۔ نیل کنڈ سلگاٹ یا صرف وتستا کہلایا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ چشمہ ویری ناگ نیل ناگ کے گاؤں کے قریب واقع ہے لیکن ویری ناگ نہیں ہے۔ جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ویری ناگ ہی وتستا کا منبع ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور روایت ملاحظہ ہو :۔

ایک روایت کے مطابق دیوی وتستا اس جگہ (ویری ناگ) سے ظاہر ہونا چاہتی تھی لیکن جب وہ یہاں پر آئی تو یہاں پر شو بیٹھا تھا۔ لہذا اسے واپس جانا پڑا اور اسے وتیھ ونرس میں سے پھوٹنا پڑا جو اس جگہ سے شمال مغرب میں کوئی

اے نیل مت پران حصہ دوم مرتبہ ڈاکٹر وید کماری گئی اشلوک ۲۵۷-۲۶۱ صفحہ ۶۷

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ایک میل دوری پر ایک چشمہ ہے سنسکرت میں "ورہ" کے معنی ہیں
واپس جانا اور نگر کے معنی میں چشمہ اور چونکہ وتستا کو اسی جگہ
سے واپس جانا پڑا لہٰذا اسے ورہ ناگ یا ویری ناگ کہا
گیا ہے[1]

اس روایت کا ذکر راج ترنگنی میں ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وتستا بار بار پاپیوں کے
چھوٹے جانے سے غصے میں آ کر غائب ہوتی رہی لیکن بار بار ہی کشیپ رشی کی درخواست
پر نمودار ہوئی اور مختلف جگہوں پر نمودار ہوئی اسی لیے روایات کے مطابق صحیح منبع
کے تعین میں دقت ہوتی ہے۔ راج ترنگنی میں 'ویتھ، ونر' کے سلسلے میں جو کچھ
لکھا گیا ہے۔ اس کی وضاحت اسٹین یوں کرتے ہیں۔

وہ کلہن اس جگہ کو وتستر (VITASTATRA) کہتا ہے۔ کلہن یہ بھی لکھتا ہے
کہ مہاراجہ اشوک نے یہاں پر ستوپا بھی کھڑے کر دیئے تھے
لیکن اس نے نیل کنڈ وتستا کا منبع قرار دیا ہے لیکن اس کا
بھی کہیں پر پتہ نہیں چلتا،،[2]

بہر حال جو کچھ بھی ہو۔ وتستا اپنے منبع سے نکل کر کھنہ بل پہنچ جاتی ہے۔ یہاں
اس کے ساتھ شمالی مشرق سے آرت اور جنوب مشرق سے بریح اور سندرن
آملتے ہیں۔ اسلام آباد کے دو تین میل شمال میں شیش ناگ سے نکلنے والے نالہ لدر
کا دودھیلا پانی اس کے ساتھ آملتا ہے جس سے پانی کا حجم بڑھ جاتا

---

[1] ہسٹری آف کشمیر از پی این کے بامزئی ص ۵۹۷
[2] راج ترنگنی حصہ دویم ص ۱۴۳۱

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہے۔ آگے چلکر میچھاڑہ میں وشو اور رمب آرہ ملتے ہیں۔ سرینگر میں دودھ گنگا، شادی پورہ سندھ اور مظفر آباد میں کشن گنگا اس میں شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح جھیل ڈل، آنچار، مانسبل ولر اور دوسرے بہت سے ندی نالوں کا پانی سمیٹتے ہوئے پاکستان میں جہلم کے مقام پر آجاتی ہے جہاں اسکا نام جہلم پڑتا ہے۔ وتستا آج اسی نام سے مشہور رہے جہلم سے میدانی علاقوں سے گذرتی ہوئی چناب کیساتھ ملکر آخر بحیرۂ عرب کی بانہوں میں سما جاتی ہے جہلم اپنے منبع سے لیکر چناب کے سنگم تک کوئی ۶۲۰ میل لمبا سفر طے کرتی ہے[۱] یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جہاں یہ وادی کے بیشتر حصے میں 'ویتھ' کہلاتی ہے اور میدانی علاقے میں جہلم بنتی ہے وہاں بارہمولہ سے لیکر مظفر آباد کے علاقے میں اسے صرف "دریا" کہا جاتا رہا ہے[۲]

وتستا کا اصلی نام جیساکہ کہا۔ گیا اب بہت کم لوگوں کی زبان پر ہے اسے اب عام طور سے جہلم ہی کہا جاتا ہے۔ صدیاں گذرنے کے بعد بھی اس کے بہاو یا اسکی گذرگاہ میں کوئی نمایاں فرق پیدا نہیں ہوا ہے۔ اپنے روایتی تقدس سے قطع نظر اس کی افادیت اور فیض رسانی سے انکار ممکن نہیں۔ یہ دریا صدیوں سے اندرونی تجارت کو بڑھانے میں اہم رول ادا کرتا رہا ہے اس کے علاوہ آمدورفت کا اہم ذریعہ رہا ہے۔ خاص کر اس زمانہ میں جب پختہ سڑکوں کا جال بچھا ہوا نہیں تھا اور نہ ہی آمدورفت کیلئے گاڑیاں، لاریاں اور بسیں وجود میں آئی تھیں سری نگر میں جہلم پر سال ہا سال سے سات پل نظر آتے رہے ہیں۔ جن کے ان پلوں کی وجہ سے اسے سات پلوں کا شہر کہا جاتا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پلوں کی

---

[۱] "راج ترنگنی" حصہ دوم صفحہ ۱۲ہ

[۲] گزیٹیر آف کشمیر اینڈ لداخ صفحہ ۵۰ہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

یہ تعداد پچھلے پانچ سو سال سے ویسی کی ویسی ہے اب حالیہ برسوں میں ان پلوں کی تعداد نو تک پہنچی ہے۔ تواریخی شواہد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہلم پر کسی زمانے میں تئیس پل تھے۔ دریائی ٹریفک کے لئے درمیان میں چھوٹا سا راستہ رکھ دیا جاتا تھا۔ تواریخی شواہد سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندو حکمرانوں کے دور میں ونستا پر کبھی مستقل پل دیکھنے میں نہیں آئے۔ ان پلوں کی بڑی خوبی یہ تھی کہ ضرورت کے وقت انکو کھول دیا جاتا تھا۔ دشمن کی یلغار کا خطرہ ہوتا یا دریا کے کسی پار آتش زدگی کی واردات ہوتی تو شہر کے دوسرے حصّے کو بچانے کے لئے کشتیوں کے پل کھول دیئے جاتے اور شہر کے دونوں حصّوں کو علیحدہ کیا جاتا۔

کشمیر کے دریاؤں خاص طور پہ جہلم کی سطح آب پر مختلف زمانوں میں کشتیاں استعمال ہوتی رہیں۔ مختلف قسم کی کشتیوں کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

یہچھ، کوچھ، ڈونگہ، شکارہ، لرہ ناو، ڈیمبہ ناو، پرندہ، ٹاستہ واز

یہچھ، باربرداری کے لیے بڑی کشتی ہے اور عام طور سے شالی اور دوسرے غلہ جات ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہے۔ اس کی پشت ڈھلوان دار ہوتی ہے بعض اوقات دریا میں پانی کی کمی کی وجہ سے یہ کشتیاں پانی کی سطح پر تیر نہیں سکتی ہے کوچھ:۔ بے چھت کی لمبی اور چوڑی کشتی ہے جو بھاری سامان خاص طور سے بالن کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہے۔ ڈونگہ کشتی بانوں کا گھر ہے۔ ملاحوں کی کافی تعداد میں ان میں ہی رہائش کرتی ہے۔ اس میں ایک چھوٹا سا باورچی خانہ بھی ہوتا ہے اور چھوٹے چھوٹے کمرے بھی سیر و تفریح کیلئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے:۔ شکارہ۔ ڈونگے کی شکل والی مقابلتاً چھوٹی کشتی جسے سواری کے استعمال میں لایا جاتا ہے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

لرناؤ:۔ اسے ہوس بوٹ بھی کہتے ہیں۔ بہت بڑی کشتی جو بعض اوقات دو منزلہ بھی ہوتی ہے جدید آرائش اور آسائشی سامان سے مزین یہ کشتی عام طور سے جھیل ڈل اور سرینگر میں جہلم کے بالائی حصوں میں ملتی ہے۔ عام طور سے لرناؤ سطح آب پر ایک ہی جگہ پر ساکن رہتی ہے۔ بڑے ہوٹلوں کی طرح سیاحوں کے کام آتی ہے۔

ڈیمبہ ناؤ:۔ یہ کشتی عام طور سے جھیل ڈل سے آبی گھاس سمیٹنے کے استعمال میں لائی جاتی ہے۔ کبھی کبھی سبزی ترکاری اور پھل پھول لینے لے جانے کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے۔

پرندہ:۔ پرندہ ایک ہلکی شاہی سواری ہے۔ یہ عام استعمال کی سواری نہیں اسے خاص تقاریب پر بڑی آرائش کے بعد استعمال کیا جاتا ہے۔ کبھی زمانے میں شاہی خاندان کے افراد اس کی سواری کیا کرتے تھے۔ آجکل اسکا استعمال دریائی جلوسوں میں کسی سرکاری تقریب پر ہوتا ہے اور اس میں خصوصی مہمانوں کو بٹھایا جاتا ہے۔ چاک واری بھی پرندہ کی قبیل کی ہی کشتی ہے۔ دونوں طرح کشتیوں کو ملاحوں کی بڑی تعداد کھیتی ہے۔

ٹاسد وار:۔ مقابلتاً چھوٹی ہلکی اور تیز رفتار کشتی ہے۔

وتستا کے روایتی تقدس کا احترام صدیوں سے کیا جاتا رہا ہے۔ حتیٰ کہ کسی زمانے میں بھادون کے روشن پندرھواڑے کی تیرہویں تاریخ (ستمبر اکتوبر) کو ایک تہوار روایتی دھوم دھام کیساتھ منایا جاتا تھا۔ اس تہوار کو ویتھ تروداہ یا وتستا تر ویشی، کہا جاتا تھا۔ وتستا کو دودھ اور مٹھائیوں کا بھوگ چڑھایا جاتا تھا۔ جہانگیر نے تزک جہانگیری میں اس تہوار کا ذکر کیا ہے۔ بادشاہ کے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

زمانے میں بھی بڑے تزک و اہتمام کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ بادشاہ خود بھی اس تہوار میں شریک ہوتا تھا۔ آر کے پارمو رقمطراز ہیں:۔

"زین العابدین چراغوں کی نمائش میں شریک ہوتا تھا۔ یہ تہوار ولستا کے جنم لینے کی خوشی میں منایا جاتا تھا جو بھادوں کے روشن پندرھواڑے کی تیرہ تاریخ کو پڑتا ہے۔ اس تہوار کو 'ویتھ تراوہ' کہتے ہیں۔" [1]

آر کے پارمو سر والٹر لارنس کے حوالے سے ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ لارنس کے زمانے (۱۹۰۵-۱۸۵۵) میں اس دن یعنی 'ویتھ تراوہ' کو والدین اپنی بیٹیوں کو تحفے تحائف بھی دیا کرتے تھے [2]

اس تہوار میں رنگ و لوز کا اجتماع ہوتا تھا اور مذہب، ذات اور طبقوں کے بھید بھاؤ کے بغیر لوگ تہوار میں شریک ہوتے تھے اور خوشیوں اور شادمانیوں سے اپنا دامن بھر لیتے تھے۔ کشمیر کے رنگا رنگ تہواروں کا ذکر کرتے ہوئے بامزئی نے اس تہوار کو خاص طور پر بیان کیا ہے۔ سرلوارہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

"چاند کی تیرھویں رات کو بادشاہ چراغوں کی اس نمائش کو دیکھنا چاہتا تھا جو ولستا کے جنم دن کی پوجا کے موقع پر ہوتی تھی۔ وہ کشتی میں سوار ہو کر راجدھانی کی طرف جاتا تھا۔ سطح آب پر تیرتے ہوئے گیت سنتا تھا۔ اور کرسی پر سوار ہونے سے پہلے یالعبدمیں شہریوں کی دعائیں لیتا تھا ..... دریا

---

[1] ہسٹری آف مسلم رول ان کشمیر از آر کے پارمو صہ ۱۴۴

[2] ایضاً صہ ۱۴۳

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کے کنارے پر جلتے ہوئے چراغوں کی قطاریں حسین لگتی تھیں اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وتستا کی پوجا کے لئے دیوتاؤں نے سنہری پھول بکھیر دیئے ہوں۔[۱]

جھیلیں اور آبی راستے

وادی کشمیر میں بڑی اور چھوٹی بے شمار خوبصورت جھیلیں ملتی ہیں۔ سرینگر کا شہر بھی اس نعمت سے خالی نہیں۔ جھیل ڈل اور آنچار سرینگر کی حدود میں شامل ہیں لہذا ان کا ذکر ناگزیر ہے۔

ڈل

کشمیری زبان میں ڈل کا لفظ جھیل کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ یہ اصل میں ایک تبتی لفظ ہے جس کے معنی ہیں ساکن[۲] ٹھہرا ہوا روایت ہے کہ یہاں کسی زمانے میں ایک چراگاہ تھی جس کا نام وتال مرگ تھا۔ ایس ایل ساد ھو قدیم روایات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"کہا جاتا ہے کہ ڈل جھیل کا اس زمانے میں وجود نہ تھا اور اس جگہ پر ایک چراگاہ موجود تھی جس کا نام وتال مرگ تھا اور بعد میں ایک زبردست بھونچال سے چراگاہ میں پانی بھر گیا اور اس نے ایک جھیل کی شکل اختیار کرلی۔"[۳]

۱۔ گزیٹیر آف کشمیر اینڈ لداخ ص ۲۷

۲۔ TALES FROM RAJTARANGNI P. 33

۳۔ ہسٹری آف کشمیر از پی این کے بامزئی ص ۵۱۲

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

جھیل ڈل کی لمبائی شمال سے جنوب کی طرف کوئی ساڑھے پانچ میل ہے اور چوڑائی مغرب سے مشرق کی طرف کوئی دو سے تین میل تک ہے پانی صاف و شفاف ہے کیونکہ اس کی تہہ میں بہت سے چشمے ابلتے ہیں۔ مارسر کی جھیل بھی ڈل کو اپنے پانی کی ٹھنڈک بہم پہنچاتی ہے۔ یہ جھیل کئی حصوں میں منقسم ہے۔ چھوٹا ڈل، بڑا ڈل، لکُٹ ڈل وغیرہ وغیرہ۔ گگری بل کی طرف پھیلے ہوئے ڈل کا حصہ بڑے ڈل سے ایک بند کے ذریعے سے کٹا ہوا ہے۔ گگری بل کی سمت کا ڈل جنوب اور مشرق کو پھیلا ہوا ہے اور بڑا ڈل مشرق کی سمت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بند پرانے وقتوں میں کسی متمول کشمیری پنڈت نے تعمیر کروایا تھا۔ یہ بند نائید کدل سے شروع ہو کر ڈل کے دوسرے کنارے نشاط سے ذرا ہٹ کر الشبر گاؤں تک کوئی ساڑھے تین میل لمبا ہے۔ ڈل کے پانیوں میں دو چھوٹے جزیرے بھی ملتے ہیں سونہ لنک اور روپہ لنک یہ اپنے پُر بہار سبزے اور چنار کے گھنے سایوں کی وجہ سے انسانی نظروں کو ایک لمحے کے لئے روک لیتے ہیں روپہ لنک کو اپنے چار چناروں کی وجہ سے چار چناری بھی کہتے ہیں۔ جھیل ڈل ایک دل فریب جھیل ہے۔ اس کے تین اطراف میں .... پہاڑوں کے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک طرف شنکر آچاریہ کی پہاڑی نظر آتی ہے جس کی چوٹی پر پرانے وقتوں کا شو مندر دور دور سے دکھائی دیتا ہے۔ اس پہاڑی کو تختِ سلیمان بھی کہا جاتا ہے۔ دوسری طرف ہاری پربت کی پہاڑی ہے۔ مغلوں کے ذوقِ جمال نے ڈل کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کیا ہے۔ ان کے بنائے ہوئے باغات ڈل کے کنارے پر دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ نشاط، شالیمار، چشمہ شاہی، نسیم باغ، رنگین پری محل اور دوسرے باغات (جو شدائدِ زمانہ سے اب مٹ چکے ہیں)

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ان باغوں کا جاہ وجلال، وجاہت اور خوبصورتی دور دور سے لوگوں کو کھینچ لاتی ہے۔ یہاں کی ہر صبح صبح بنارس ہے اور ہر شام شام اودھ، صبح بنارس اور شام اودھ ایک ہم ہو تو ہو لیکن یہاں کی ہر سحر یہاں کی سحر ہے اور یہاں کی ہر شام یہاں کی شام ہے اور صبح وشام کا طلسم یہاں پر ختم ہے۔

آنچار

سرینگر کے شمال ومغرب میں ایک دودھیلے پانی کی شفاف جھیل آنچار ہے یہ جھیل دریائے سندھ کے علاوہ پانی کے امنڈنے سے بنتی ہے تکونی شکل کی اس جھیل کا ذی وار سراسر سرینگر کی حدود کے ساتھ دور دور تک پھیلا ہوا ہے اس کی زیادہ سے زیادہ لمبائی ۷ میل اور چوڑائی ۵ میل ہے۔ کسی زمانہ میں سرینگر کے گرد گھومتا ہوا نالہ مار اسی جھیل میں گرجاتا تھا۔ آنچار ایک گہری جھیل ہے۔ مچھلیوں کے شکار کے لئے بہت مشہور ہے۔

جہلم ڈل اور آنچار کے علاوہ سرینگر میں اور بھی کئی آبی راستے ہیں۔ ان سے زمانہ قدیم سے لے کر آج تک برابر آمد و رفت اور رسل و رسائل میں کافی سہولیت ہوتی رہی ہے۔ سڑکوں کا جال بچھ جانے سے اب ان کی افادیت کم ہوگئی ہے اور ان کی حیثیت ثانوی رہ گئی ہے چند ایک اہم نالے یہ ہیں:-

کٹھ کول

یہ ایک چھوٹا سا آبی راستہ ہے جو جہلم کے بائیں کنارے سے شیر گڈھی کے شاہی محلات کی دیواروں کے ساتھ سر پٹکتا ہوا الگ راستہ اختیار

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کر لیتا ہے اور ٹنکی کدل گلاب باغ سے ہوتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس کی ایک شاخ مغرب میں بہتی چلی جاتی ہے اور سید منصور کی زیارت کے قریب دو حصوں میں بٹ جاتی ہے مغربی شاخ سونہ کول کہلاتی ہے اور چھوٹی اور کم گہری ہے۔ دوسری شاخ سید منصور کے پل سے گذر کر درلش کدل سے بہتی ہوئی جھپتہ کدل سے ملتی ہے کٹہ کول کی اصلی شاخ شمالی سمت سے بہتے ہوئے پھر مغرب کی طرف چلی جاتی ہے اور صفا کدل کے نزدیک جہلم کے ساتھ پھر مل جاتی ہے۔ اس آبی راستے سے جہلم کے بائیں طرف کی اندرونی آبادی مل جاتی ہے۔ آبی راستوں کے کم استعمال کئے جانے کی وجہ سے اب اس کا استعمال بھی کم ہو گیا ہے۔ سرینگر کے بالائی حصوں سے چلنے والی کشتیاں جن کو شہر سے باہر جانا ہو اسی راستے کا عام طور سے استعمال کرتی ہیں۔ راج ترنگنی میں کٹہ کول کا نام KSIPTIKAKULYA بتایا گیا ہے۔ کلہن کا خیال ہے یہ کٹہ کول دراصل بچاؤ کی ایک قدرتی لائن تھی اور جہلم سے خود بخود الگ ہوگئی ایسا لگتا ہے کہ اس کے زمانے میں دشمنوں نے سرینگر شہر کا محاصرہ کیا تھا۔

نالۂ مار

سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی یہ "سانپ کی نہر" ڈل کے جنوب مغربی حصے سے گذرتی تھی۔ یہ نالہ کئی شاخوں میں بٹا ہوا تھا۔ اور سارے شہر کے اندرون کو ملاتا تھا۔ یہ شہر میں سے گذرنے والا سب سے بڑا نالہ تھا اور ڈل اور آنچار کو ملاتا تھا۔ آمدورفت کا ایک اہم ذریعہ ہونے کے علاوہ اندرونی تجارت کو بڑھانے میں بڑا مفید تھا۔ ابھی حال

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تیا پانی کم ہو جانے کی وجہ سے اس کی افادیت ختم ہو گئی تھی اور اس کو بند کر کے ایک گول سڑک تعمیر ہوئی ہے۔

ژونٹھ کول

یہ کول جھیل ڈل کو ولستا کے ساتھ ملاتی ہے۔ پرانے وقتوں میں اس کو مہاسارت کہا جاتا تھا۔ اس جگہ یہ چھوٹی سی ندی ایک جزیرہ بناتی تھی جسے کلہن کے زمانے میں ماک سی کاس وامن
MAKSIKASVAMIN
کہا جاتا تھا اور اب اسے مائیسمہ کہتے ہیں۔ جس جگہ پر ولستا اور ژونٹھ کول ملتی ہے اس کو پرانے وقتوں میں ایک مہان تیرتھ مانا جاتا تھا اور 'مان کھا' کے نام سے موسوم تھا اس کا دوسرا نام ماری سام گامس MAKISAMGAMAS [1] بھی تھا۔

دودھ گنگا

ولستا کے بائیں کنارے سے صرف چند سو گز دور دودھ گنگا کا نالہ ملتا ہے۔ کلہن کے مطابق اس کا پرانا نام " دھگدھ سندھو" ہے اور اس کا منبع چٹیا پتھر (سنگ سفید) ہے جو یوس مرگ کی طرف ایک پہاڑی چشمہ ہے۔ تحصیل چاڈورہ سے ہوتے ہوئے، جنگلی پتھروں سے ٹکرا کر چور چور ہوتے ہوئے سرینگر سے گذرتا ہے۔ سرینگر میں سے چھتہ کول بھی کہا

---

[1] راج ترنگنی (حصہ دویم) مترجمہ ارل سٹین ص ۱۱۶

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

جاتا ہے۔ کیونکہ یہ چھتہ بل سے گزرتا ہے۔ سرینگر میں اس نالے میں کشتی
رانی بھی ہوتی ہے۔ جس جگہ یہ وتستا کے ساتھ اس کا سنگم ہو جاتا ہے وہ کسی
زمانے میں ایک بڑا تیرتھ تھا اور ویدہ مٹھ کہلاتا تھا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کلہن اور راج ترنگنی

وقت کی بیکراں وسعتوں کو چیرتے ہوئے جب نظریں ماضی کے دھندلکوں کو ٹٹولتی ہیں۔ تو علم و عرفان کے بے پناہ سرچشمے ابلتے ہوئے ملتے ہیں اور ان خطر فریب شاہراہوں کو لازوال بناتے ہیں جو جنت ارضی کے ہر ذرے میں بسے ہوئے ہیں فلسفہ فن، علم، فضل کون سا شعبہ ہے جہاں ہمارے اسلاف نے چراغ نہ جلائے ہوں۔ ناگ ارجن، اشوگھوش، چرک، ولبھ دیو، بھیسم بھٹ، واسوگپت، بھاسکر آچاریہ، ابھینو گپت، کھشمندر، بلہن اور ایسے ہی بیسوں عالم و فاضل تابندہ ستاروں کی ایک کہکشاں ہے، جو ہمارے نیلے آسمان کے نیچے چمک کر دور دور تک نور کی لکیریں پھیلاتی رہی ـــ ان ہی روشن دماغوں میں کلہن پنڈت کا نام بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ جو آج سے لگ بھگ ۸۳۲ سال قبل ہماری سرزمین میں پیدا ہوا اور اپنے کارناموں کے لئے صدیوں تک زندہ رہے گا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

میں کہا گیا ہے کہ اس کی ٹکر کی منظوم تواریخ آج تک کسی زبان میں نہیں لکھی گئی ہے۔ ۷۸۲۶
اشلوکوں پر مشتمل یہ کتاب شاعری کے میڈیم میں تواریخ کے پانچ ہزار برسوں کو سمیٹتے ہوئے
لکھی گئی ہے۔ اس عظیم کارنامے کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ شاعری کے لوازمات کو
برتتے ہوئے اس میں کشمیر کی قدیم تواریخ کو پیش کیا گیا ہے، یہ بات وثوق کے ساتھ
کہی جاسکتی ہے کہ عالمی ادب میں اس طرح کے شاہکار اگرچہ نایاب نہیں کم یاب ضرور ہیں۔
پنڈت نہرو اس کتاب کو تواریخی، سماجی اور معاشیاتی معلومات کا خزانہ قرار دیتے ہیں۔[۱]
مشہور مورخ آر، سی، مجمدار اس کی عظمت کا اعتراف یوں کرتے ہیں:-

"ہندوستان کے قدیم ادب میں یہ واحد کارنامہ ہے جسے صحیح معنوں میں
ایک تواریخی نسخہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ مصنّف نے نہ صرف موجودہ
مسودوں اور دوسرے ماخذات سے مواد جمع کیا ہے۔ بلکہ کتاب
کے ابتدائی صفحات میں ان چند اصولوں کا ذکر کیا ہے، جو یہ تواریخ
لکھتے وقت اس کے پیش نظر رہے۔ ان اصولوں کے مطالعہ
سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد سے کہیں آگے تھے۔ بلاشبہ یہ
اصول ایسے ہیں جو انیسویں صدی تک تاریخ کے تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ
کے لئے بروئے کار نہیں لائے جاتے تھے"[۲]

راج ترنگنی آٹھ ترنگوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ ہر ترنگ کے اختتام پر لکھا ہے:-
راج ترنگنی کی پانچوں ترنگ ... اختتام پذیر ہوتی ہے جسے کشمیر کے مایہ ناز
وزیر چمپک کے بیٹے کلہن نے تصنیف کیا۔"

۱۔ G.C. PANDITA : RIVER OF KINGS (INTRODUCTION) PAGE 12,

۲۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

راج ترنگنی سنسکرت شاعری کا ایسا کارنامہ ہے جس میں کشمیر کی تواریخ کے مختلف ادوار کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اپنی تمام خامیوں کے باوجود یہ تصنیف کشمیر کے حکمرانوں کے دور حکومت کو ۱۱۴۸ء تک سمیٹ لیتی ہے جب کلہن نے اسے تصنیف کیا ہے۔ اور بعض بے ربطیوں کے باوجود یہ تصنیف کشمیر کی تواریخ کا ایک سلسلہ وار تذکرہ ہے والٹر لارنس اس بات کا ذکر یوں کرتے ہیں :۔

"کشمیر میں ابتدائی سلطنتوں کے روایتی کردار اور مصنوعی تاریخ وار سلسلہ واقعات کو رد کرتے ہوئے جو پہلے ترنگوں میں ملتا ہے اور جو تاریخی تنقید کی تند آندھی کے باوجود آزمائشوں میں پوری اتری ہے، اس کتاب کو ساتویں صدی عیسوی کے مابعد ایک معتبر یادداشت تسلیم کیا جا سکتا ہے۔"[۱]

راج ترنگنی کے فاضل مترجم ارل سٹین کے مطابق کلہن نے اس کتاب کا مقدمہ ۴۲۲۴ لوکیکا مطابق ۱۱۴۸-۱۱۴۹ء میں لکھا۔ اور اسے دو برس میں مکمل کیا۔ یہ راجہ جے سمہا کا دور حکومت تھا۔ یہ صحیح ہے کہ کلہن کشمیر کا پہلا مورخ نہیں ہے، بلکہ اس سے قبل کئی لوگوں نے تاریخ جیسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ کلہن نے خود اپنے پیش رو مورخین کا ذکر کیا ہے لیکن کوئی ایسا کارنامہ منظر عام پر نہیں آیا ہے، اس لئے راج ترنگنی کو کشمیر کی تاریخ سے متعلق اولین ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ تاریخ نویسی ایک مشکل اور صبر آزما فن ہے اور زبردست ریاضت کا متقاضی ہے اس کے لئے مورخ کو کئی ہفت خوان طے کرنا پڑتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس زمانہ میں کشمیر میں تاریخ نویسی کا رجحان پیدا ہوا وہ دور اپنے محدود وسائل کے باعث کافی مشکلات کا دور تھا۔ رسل و رسائل کی دقتیں تاریخی مواد کی نایابی، مخطوطات اور دوسرے ماخذات کی کم یابی جدید سائنٹیفک اور تواریخی ذہن کی عدم موجودگی میں یہ کام انتہائی کٹھن تھا۔ اس لئے کلہن سے قبل جن لوگوں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

۱۔ والٹر لارنس :۔ ویلی آف کشمیر صفحہ ۱۸۰

نے تاریخ جیسے موضوع پر قلم اٹھایا۔ ان کا کام کارنامے کی حیثیت اختیار نہ کر سکا۔ اور وقت کی بے پناہ وسعتوں میں گم ہو گیا۔

کلہن پنڈت ازل سے ہی زبردست ذہانت اور ذکاوت لے کر آیا تھا نہ صرف یہ کہ اُسے شعر کہنے میں کمال حاصل تھا۔ بلکہ شعر کے قالب میں تاریخ جیسے موضوع کو سمیٹنا اس پر ختم ہے کلہن کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنی راج ترنگنی میں تاریخ نویسی کے اصول وضع کئے اور ان سے بحث کی۔ اس کے ساتھ ہی ان ماخذات کی نشان دہی کی جن سے اس نے استفادہ کیا ہے' کلہن نے اپنے دور کے محدود وسائل کے باوجود اپنے دور کے سکولوں' پنڈتوں اور اپنے پیش رو مورخوں سے اکتساب فیض کیا ہے۔ اس کا اعتراف اس نے فراخدلی اور خلوص کے ساتھ کیا ہے۔

سر اُرل سٹین کے مطابق کلہن بارہویں صدی کے آغاز میں پری ہاس پور (موجودہ پرس پور) میں پیدا ہوا۔ لیکن حتمی طور پر اس کی تاریخ ولادت معلوم نہیں ہے راج ترنگنی ۱۱۴۸ء ۱۱۴۹ء میں لکھی گئی' قیاس غالب ہے کہ کلہن اس زمانہ میں شباب کی سرحدوں سے گذر چکا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کلہن کی پیدائش بارہویں صدی کے آغاز میں ہوئی ہوگی۔ یہ وہ دور تھا جب مہاراجہ ہرش (۱۰۸۹-۱۱۰۱ء) اور اُس کے پیش رو بادشاہوں کی من مانیوں سے کشمیر میں غارت گری کا بازار گرم تھا۔ ہرش کے بعد اس کے رشتے کے بھائیوں' سُہل اور اُچل نے سارے ملک میں خون ریز بغاوت شروع کر دی تھی۔ ڈامروں نے اپنے مظالم سے نظام سلطنت کی بنیادیں کمزور کر دی تھیں کلہن کا شباب اسی افراط و تفریط میں گذرا۔ اس کے والد کا نام کاشمیرک مہاماتی چنپک یا چمپک تھا۔ جو مہاراجہ ہرش کے دور میں دوارپتی یا شہری دروازے کا داروغہ تھا' اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سرحدی علاقے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کا دفاعی افسر تھا۔ اس بات کے باوجود کہ مہاراجہ ہرش کے ذمہ داراعلیٰ نے سازشوں سے کام لیا وہ درد علاقے میں وگدھ گھاٹ کا محاصرہ کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس زمانے میں جب مہاراجہ ہرش چاروں طرف مایوسیوں سے گھرا ہوا تھا۔ چمپک نے ایک نمک حلال اور وفادار ساتھی کی طرح راجہ کا ساتھ دیا۔

کلہن کا اصلی نام کلیان تبایا جاتا ہے۔ ارل سٹین کے مطابق یہ اپ بھرنش کا لفظ ہے۔ جو پراکرت لفظ "کلان" سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی البتاش بابرکت وغیرہ ہے[1] وہ برہمن نسل تھا اور شیومت سے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ راج ترنگنی کی ہر ترنگ کا آغاز شیو اور پاروتی کے مبارک نام سے کرتا ہے لیکن مذہب کے معاملات میں وہ بے حد آزاد خیال تھا اور بودھ مذہب کا احترام اسی جذبے سے کرتا تھا۔ جس جذبے سے برہمن مت سے محبت کرتا تھا۔ دراصل کلہن کے خاندان میں یہی روایت چلی آرہی تھی، کلہن کا چچا کنک و راگ ودیا کا ماہر تھا۔ وہ راجہ ہرش کا درباری سنگیت کار تھا حتیٰ کہ راجہ ہرش خود بھی اس سے موسیقی میں درس لیا کرتا تھا۔ کنک بودھ مذہب کا پیرو تھا۔ کلہن اپنی خاندانی روایات کے باعث ہندو اور بودھ مت کے گہوارے میں پل کر پروان چڑھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں دونوں دھرموں کے تئیں عقیدت اور احترام کے جذبے ملتے ہیں، کلہن نے جگہ جگہ مہاتما بدھ اور اس کے دھرم کا ذکر انتہائی محبت اور احترام سے کیا ہے۔

کلہن بہت بڑا عالم اور فاضل تھا۔ سنسکرت زبان پر زبردست قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ دوسرے کئی علوم سے بھرپور واقفیت رکھتا تھا۔ چنانچہ عروض، صرف، نحو، معاشیات، شعریات اور ہیئیات پر اسے مکمل گرفت حاصل تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مصوری، رقص، موسیقی اور کئی دوسرے فنون لطیفہ سے بھی دلچسپی رکھتا

[1] سر ارل سٹین، راج ترنگنی جلد اول صہ ۱۳

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تھا۔ اس کے علاوہ اسے اپنے عہد اور اپنے ماقبل عہد کے سنسکرت ادب پر بھی گہری نظر تھی یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں خوبصورت اور سحر انگیز شاعری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔

ہرش کے والد چمپک نے اپنے زمانے میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے اور ملکی نظم و نسق میں دسترس حاصل کی تھی۔ لیکن کلہن کو ایسا زمانہ حاصل نہ ہو سکا۔ وہ ایسے زمانے میں پلا بڑھا۔ جب سیاسی اور سماجی نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ اس لیئے وہ اس میدان میں اپنے جوہر نہ دکھا سکا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح اپنا اظہار چاہتا تھا۔ چاروں طرف دروازے بند پاکر وہ شعر و شاعری کرنے لگا اور اسی وسیلہ اظہار میں اس نے تاریخ نویسی کو نا شروع کی سر ارل سٹین رقم طراز ہیں :-

"ناموافق سیاسی حالات اور غالباً خاندانی مصلحتوں نے اس پر فوج اور انتظامیہ کے دروازے بند کر دیئے تھے۔ اسی لیئے موروثی مذاق کا تقاضا تھا کہ وہ اپنی ادبی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اپنے ملک کی تواریخ کے بارے میں روایات کو قلم بند کرے اور ان ادوار پر اپنے خیالات کا اظہار کرے جن میں سے وہ زندگی گذار چکا تھا۔"[1]

کلہن ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر ہونے کے علاوہ ایک قابل تاریخ نویس تھا۔ کشمیر کی پرانی تواریخ سے جانکاری حاصل کرنے کے لیئے کلہن کی راج ترنگنی کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے، اس بات سے قطع نظر کہ کلہن روایت اور تواریخ کے درمیان حد فاصل مقرر کرنے میں ناکام رہا ہے اور یہ کہ حالات اور واقعات کے تسلسل میں خامیاں موجود ہیں۔ کوئی سنجیدہ ذہن اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ کلہن اپنے آس پاس کی زندگی سے

---

[1] سر ارل سٹین، راج ترنگنی جلد اول صـ ۲۱

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

نا بلد تھا۔ وہ ایک بے باک صاف گو اور باضمیر مورخ تھا اس نے کشادہ دلی سے اعتراف
کیا ہے کہ اس نے اپنے پیش رووں سے اکتساب فیض کیا ہے۔ خاص طور پر ماتما اور
چیرت اور اس طرح کے مسودات سے استفادہ کیا ہے۔ کلہن نے اس سلسلے میں گیارہ
کارناموں کا ذکر کیا ہے[1] جن سے اس نے اپنا چراغ جلایا ہے۔ جدید تواریخی نقطۂ نظر
کے مطابق سنسکرت میں تواریخی مواد موجود نہیں ہے۔ اس خیال کے مطابق راج ترنگنی میں
بھی کوئی تواریخی مواد نہیں ہے لیکن ایسا کہنا کلہن کی عظمت سے انکار کرنے کے مترادف ہے
یہ بات قابلِ فکر ہے کہ کلہن کے زمانہ میں تاریخ نویسی کے اصول مقرر نہیں تھے۔ یہ بات بھی
اہم ہے کہ کلہن نے خالصتاً "تاریخ نہیں لکھی ہے بلکہ کشمیر کے راجاوں کی کہانی رقم کی ہے
اسی لیے کلہن اپنی تصنیف کو "راجوں کا دریا" کہتا ہے، لیکن راجوں اور مہاراجوں کے عروج
وزوال کی کہانی ہونے کے باوصف راج ترنگنی کی تواریخی اہمیت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔
کلہن نے ماضی کے اس دور کی سیاسی، سماجی اور مذہبی زندگی کے بارے میں براہ راست کوئی
بات نہیں کہی ہے۔ لیکن راجاؤں کے ادوار کے ذکر میں کسی نہ کسی پہلو سے عوامی زندگی
کا بالواسطہ ذکر ضرور آیا ہے۔ اس نے انتہائی جرأت اور بے باکی کے ساتھ خاص طور
پر اپنے عہد کے حالات کا جائزہ لیا ہے کلہن راجہ سہیل (۱۱۱۲ء سے ۱۱۲۸ء) اور راجہ جے سمہا
(۱۱۲۸ء، ۱۱۴۹ء) کے عہد کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اور اسی عہد کا اسے شعوری مشاہدہ
تھا۔ اس لئے اس نے اس پورے عہد پر بھرپور تنقید کی ہے۔ اس نے امیروں کو تضحیک
کا نشانہ بنایا ہے اور بادشاہوں کی کوتاہیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ بعض اوقات محسوس
ہوتا ہے کہ جس طرح کی باتوں کا اظہار کلہن نے کیا ہے، وہ اس زمانے میں سزا دلانے
کے لئے کافی تھیں،[2]

---

[1] سر اورل سٹین، راج ترنگنی، جلد اول ص ۲۴
[2] پی این کے بامزئی، اے ہسٹری آف کشمیر ص ۲۵

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کلہن کے ضمیر اور ایمان کی توانائی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس نے جاہ حشمت اور انعام و اکرام کی پروا کئے بغیر اپنے زمانے کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔ وہ سارے ملک میں گھوما اور نہ صرف اپنے زمانے کے مندروں، ستونوں اور مقدس مقامات کی سیر کی، بلکہ پرانے کھنڈرات کی خاک بھی چھان لی اور ان معلومات کو پوری جزئیات نگاری سے سمیٹ لیا۔ اس سے اس کی بے پناہ صلاحیتوں کا قایل ہونا پڑتا ہے، اس سلسلے میں کلہن کے ان فقروں پر بھی غور کیجیے جن سے اس کے ذہن اور فکر کی نشان دہی ہوتی ہے:۔

"وہ شریف الطبع شاعر قابل ستائش ہے جس کے الفاظ ایک سچے منصف کی طرح زمانۂ قدیم سے متعلق حق گوئی کرتے وقت محبت یا نفرت کے جذبات سے احتراز کرتا ہے۔"[1]

کلہن کے نزدیک شاعری کا معیار یہ ہے کہ شاعر حق گو اور اپنے جذبات سے بالاتر رہ کر حق گوئی سے واقعات و حالات کا تجزیہ کرے۔ اس اصول کا اطلاق اس نے خود اپنی شاعری پر بھی کیا ہے، وہ بادشاہوں اور ان کے قایم کئے ہوئے سیاسی نظاموں کی خامیوں کی پول کھولتا ہے، اور جھوٹ اور فریب کے طلسم سے کبھی مرعوب نہیں ہوتا وہ راجہ ہرش کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ حالانکہ اس کے ہاتھوں اس کے خاندان کے وقار میں اضافہ ہوا تھا۔[2] وہ بڑے سلیقے سے ان تمام عناصر کا "مونڈن" کرتا ہے۔ جو اس کی نظروں میں مشکوک اور قابل نفرت ہیں وہ اپنے دور کے سرکش اور ظالم ڈاکروں کو تضحیک کا نشانہ بناتا ہے۔ جنہوں نے ملک میں خانہ جنگی کی آگ لگائی تھی۔

---

[1] پی این کے بامزئی :۔ اے ہسٹری آف کشمیر ص ۳۵

[2] (ایضاً)

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

وہ برہمنوں کی جابرانہ ذہنیت کی دھجیاں اڑاتا ہے۔ وہ ان تمام طبقوں کے مظالم اور غیر انسانی سلوک کو بے نقاب کرتا ہے، جو عوام کا استحصال کرتے ہیں لیکن جہاں کہیں انصاف رواداری محبت حب الوطنی اور بھائی چارے کے واقعات سامنے آئے ہیں کلہن نے بخل سے کام نہیں لیا ہے وہ ایسے لوگوں کو داد و تحسین دیتا ہے۔

کلہن کو کبھی درباروں میں جانے کا موقع نہیں ملا اور نہ ہی اس نے اس بات کو اپنی سعادت تصور کیا۔ کلہن نے اس سعادت کو حاصل کرنے کے لئے کوئی کوشش بھی نہیں کی اس نے بادشاہ وقت کی ثنا خوانی نہیں کی اور نہ ہی مبالغہ آمیز قصائد کے دفتر تیار کئے۔ کلہن کی حق گوئی اور بے باکی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اپنے زمانہ کے راجاؤں کے ذاتی کردار پر مورخانہ ایمانداری سے قلم اٹھایا جس انداز نظر کو سامنے رکھ کر کلہن نے اپنے اس عظیم کارنامے کو پیش کیا اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کبھی بھی شاہی کرم فرمائی کی توقع نہیں رکھتا تھا[1]۔ لیکن یہ بات بھی تسلیم کرنا ہوگی کہ ہر اچھی بات اور ہر اچھے کام کے لئے اس نے تعریفوں کے موتی لٹائے ہیں۔

اس بات کے باوصف کہ کلہن کو وہ زمانہ ملا جب سیاسی اعتبار سے کشمیر میں زبردست اتھل پتھل تھی، اس نے اپنی پسند ناپسند کو اپنی تصنیف کا معیار نہیں بنایا بلکہ ایک منصف مزاج اور روشن ضمیر مورخ کے منصب کو اس نے پوری ذمہ داری کے ساتھ نبھایا۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے اپنے چاروں طرف کھلی آنکھ سے دیکھا۔ اتنا ہی نہیں اس نے اپنے ذہن اور ضمیر کے دریچے بھی کھول دیئے کلہن نے صدیوں کے تاریخی واقعات کو شاعری کے پورے لوازمات کے ساتھ جس طرح سنگار کیا وہ اس پر ختم ہے، اس کا یہ عظیم کارنامہ صدیوں تک فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] ارل سٹین، راج ترنگنی جلد اول صفحہ ۱

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

لل دیدؔ — افسانہ یا حقیقت

تس پدمان پورچہ للے

تمہ گلہ گلے امرت چوٗد

شو ژوٗرن تھلہ تھلے

تیُتھ مےٚ وَر دِتو دِوو

(پدمان پور کی اس للّہ کو آفرین، جس نے امرت کے گھونٹ پی لئے اور کائینات میں شِو کو پانے کی جستجو کی۔ اے پروردِگار! مجھے بھی ایسا ہی ذوقِ جستجو عطا کر) ——— (شیخ العالم رح)

چھ سو سال قبل شیخ العالم جیسی پاک نفس شخصیت نے جنگلوں کے سناٹوں اور بستیوں کے ہنگاموں میں گھومنے والی ایک ننگ دھڑنگ، آوارہ گرد اور اپنے آپ سے بے خبر مجذوبہ کے ذوقِ طلب کو مندرجہ بالا اشعار میں، خراجِ تحسین پیش کیا تھا جس نے اپنے روحانی تجربوں اور باطن کی چھپی ہوئی روشنی کو پہلی بار کشمیری

لہ دید (کشمیری) اردو میں دید لکھا جاتا ہے۔ اس کے معنی ماں کے ہیں۔ اس لئے لل دید بمعنی لل ماں کے ہیں کشمیر میں اللہ عارفہ کو اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

زبان میں ایک انوکھے اور رسیلے انداز میں نظمایا تھا۔ یہ آواز اپنے نرالے آہنگ اور رسیلے لہجے کی دھیمی آنچ میں لپٹی ہوئی ایک بالکل نئی آواز تھی جس نے نہ صرف اپنے عہد کے بلکہ اس زمانے سے لے کر آج کے لمحوں تک برابر لوگوں کو برمایا ہے۔ اپنے ظاہری وجود سے بے پروہ اور اپنے حقیقی معبود کے برہ میں سُلگتی ہوئی یہ خاتون پدماوتی تھی جس نے چودھویں صدی کے وسط میں جنم لیا تھا اور جسے کشمیر میں للہ الیشوری یا لل دیدؔ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

چودھویں صدی اپنے جلو میں کشمیر کے لئے اضطراب اور انتشار لے آئی تھی۔ اس صدی کے آغاز سے ہی کئی سیاسی اور سماجی انقلابات رونما ہوئے جن سے کشمیر کی تاریخ بے حد متاثر ہوئی۔ شاہ میر نے راجہ اودین دلیو کی بیوہ کوٹا رانی کو تخت سے ہٹا کر اسلامی حکومت کا پہلا پتھر رکھا۔ یہ ۱۳۳۹ء کی بات ہے۔ اسی زمانے میں میر سید علی ہمدانیؒ اور اُن کے ساتھی کشمیر آئے۔ ان کی آمد سے اسلام کی تبلیغ کا کام شروع ہوا۔ صدیوں پرانی ہندو اور بودھ تہذیب کے اثرات کم ہونے لگے اور ایک نئے طرزِ فکر کا آغاز ہوا۔ شروع شروع میں بودھ مت اور ہندوؤں کے ترک فلسفے سے جو نظامِ زندگی مرتب ہوا تھا اسلامی فکر کے ساتھ شدت کے ساتھ متصادم ہوا۔ افکار کے اس تضاد نے یہاں کے لوگوں کو ایک عجیب مخمصے میں ڈال دیا۔ اس صورتِ حال میں عام لوگوں کے لئے صحیح سمت کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ ایک طرف صدیوں پرانے جانے پہچانے عقائد اور روایات تھیں اور دوسری طرف اسلام کی نئی روشنی۔ اس دور راہے پر بڑے بڑوں کے حوصلے شکست ہو گئے وقت کا تقاضا تھا کہ اس نازک موقعہ پر کوئی رہنما سامنے آئے جو غیب کے دروازے کھول کر مضطرب اور بے قرار دلوں کو سکون بخش دے۔ لوگوں کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور کئی اہل

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دل صوفی، سنت اور مشائخ، قلندر اور پاک نفس اسی زمانے میں سامنے آئے اور وہ اسرار جن سے لوگ حیرت زدہ تھے سمجھ میں آنے لگے۔ ان بزرگوں نے اپنے طرز عمل سے لوگوں کے دل جیت لئے اور آدرشوں اور خیالات کی جس سنگ کی آگ سُلگ اٹھی تھی اُسے آہستہ آہستہ بجھا دیا۔ اس عہد کی بے چینی کا ذکر کرتے ہوئے بامزئی رقم طراز ہیں:۔

"مذاہب کے اس اُبال کے عہد میں مذہب کو سمجھانے کے ایک ایسے طریقہ کار کی ضرورت تھی جو تمام ذاتوں کا احاطہ کر سکے اور دماغ سے زیادہ دل کو متاثر کر سکے۔ کشمیر کی دینی اور فلسفیانہ روایات اس مقام پر بارآور ثابت ہوئیں۔ کئی صوفی اور سنت سامنے آئے جو اپنی تعلیمات اور نفی ذات کی زندگی سے دھرم اور اخلاق کے زندہ پیکر تھے۔ ان لوگوں کی پہلی صف میں عظیم عارفہ للہ الیشوری تھیں جن کو عام طور سے لل دید کہا جاتا ہے۔" [۱]

لل دید چودھویں صدی کے اس انتہائی بحرانی دور میں، جب کشمیر میں صدیوں سے استوار ایک نظامِ حکومت ہچکیاں لے کر دم توڑ رہا تھا اور ایک نئے نظام کے لئے آغوش کھولے ہوئے تھا۔ اور ایک قدیم مذہبی فکر مقابلتاً نئے دینی عقاید کے ساتھ برسرِ پیکار تھی، کشمیر کے اُفق پر نمودار ہوئیں۔ اس بات کے باوجود کہ انہوں نے اپنی فکری بالیدگی اور باطنی نُور کی روشنی سے صحیح سمت کی نشاندھی کی۔ اکثر تاریخوں اور نیم تاریخی تذکروں میں مورخوں کی تساہل پسندی کا نشانہ بن گئی ہیں۔

۱۔ KOSHUR SAMACHAR (LALDED NUMBER 1970-71) PAGE: 13

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

چنانچہ بعض اہم مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے پُراسرار خاموشی اختیار کر کے لل دید کے بارے میں شک وشبہ کی گنجائش پیدا کردی ہے اور اس کے اردگرد پُراسراریت کا ہالہ بُن لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی زندگی کے بیشتر گوشے نظروں سے اوجھل ہیں۔ لیکن اس کے باوجود لل دید کا وجود روزِ روشن کی طرح ایک حقیقت ہے۔ تذکروں اور تاریخوں میں لل دید کے بارے میں سہو کی وجہ غالباً بقول پروفیسر جے لال کول یہی ہو سکتی ہے کہ یہ کتابیں جدید تقاضوں کے مطابق تواریخیں نہیں ہیں اور صرف بادشاہوں یا سیاسی واقعات کا بیان ہیں۔ چنانچہ جونراج، شری ور، ملک حیدر، پیر حابط مصنف بہارستان شاہی اور کئی دیگر مورخین نے للّہ کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ بعد کے مورخین میں سے خواجہ اعظم دیدہ مری، حسن کھویہامی، بابا داود مشکواتی وغیرہ نے اپنی اپنی بساط کے مطابق اس عظیم عارفہ کے بارے میں لکھا ہے

للہ ایشوری کی تاریخ پیدائش خاصی متنازعہ فیہ رہی ہے۔ مورخ حسن نے اگرچہ اپنی تاریخ میں للّہ کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اور کئی متنازعہ مسائل کے لئے جگہ پیدا کی ہے۔ مگر وہ بھی اس کی تاریخ پیدائش کا ذکر حتمی طور پر مورخانہ صداقت کے ساتھ پیش نہیں کر سکے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں :-

"ساتویں صدی ہجری میں سیمپور گاؤں کے ایک پنڈت گھرانے میں پیدا ہوئی۔ یوم ولادت اور تاریخ وفات کا درست پتہ نہیں "[۱]

آر، کے، پارمو اپنی کتاب میں للہ کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تاریخ ولادت کے

---

[۱] : تاریخ حسن (تذکرہ اولیائے کشمیر) تیسرا حصہ ص ۷۴۴

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بارے میں بڑا ہی مبہم انداز اختیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"وہ (للہ) پاندریٹھن میں پیدا ہوئی۔ اس کی ولادت اور وفات کی صحیح تاریخوں کا تعین کرنا مشکل ہے۔ جب وہ سید علی ہمدانی رح (۱۳۸۰-۱۳۸۴) سے ملیں تو اس وقت وہ ایک بالغ خاتون ہوئی ہوں گی" [1]

البتہ صوفی نے اپنی تاریخ کشمیر میں للہ کی تاریخ پیدائش قطعیت کے ساتھ یوں لکھی ہے :

"للہ عارفہ ۷۳۵ھ بمطابق ۱۳۳۵ء میں اودیان دیو کے عہد میں پیدا ہوئیں۔" [2]

چناں چہ اپنی دلیل کے جواز میں وہ عبدالوہاب شائق کا ایک فارسی شعر سند کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ شعر یوں ہے ؎

فزون بود بہ ہفت صد سی و پنج
ز ویرانہ شد پدیدار گنج

پریم ناتھ بزاز، صوفی کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔ ان کے مطابق بھی للہ الیشوری کی تاریخ پیدائش ۱۳۳۵ء ہے ان کا بیان ملاحظہ ہو:

"للہ ۱۳۳۵ء میں پیدا ہوئیں جب کہ اودیان دیو تخت نشین تھا اور ہندو راج بڑے کرب سے بستر مرگ پر دم توڑ رہا تھا" [3]

---

[1] ہسٹری آف مسلم رول ان کشمیر ص ۱۰۷

[2] کشمیر حصہ دوئم - ص ۳۸۵

[3] DAUGHTER OF VITASTA PAGE: 126

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

خواجہ اعظم دیدہ مری نے اپنی تاریخ اعظمی میں للہ کی پیدائش کا ذکر تو کیا ہے لیکن صحیح تاریخ بتانے سے گریز کیا ہے۔ وہ صرف یہ بتا سکے ہیں کہ للہ کا زمانہ سلطان شہاب الدین کا زمانہ تھا جس کا دورِ حکومت ۱۳۵۴ھ سے ۱۳۷۳ء تک پھیلا ہوا ہے۔ للہ الشوری کے ساتھ سلطان کی شہزادگی کے زمانے کی ایک ملاقات کا ذکر یوں کیا گیا ہے:۔

"سلطان شہاب الدین پسر سلطان علاؤالدین بعد فوت بزرگوار به مشورۂ امرائے نامدار بر تخت نشست کہ پیش از جلوس در زمان پدر حالی مقدار طرف جنگلے بہ تقریب شکار رفتہ بود واز مجذوبۂ کاملہ دو پیالہ شیر خوردہ دلبشارت سلطنت یافتہ بود گویند کہ آں مجذوبہ للہ عارفہ است" [۱]

بامزئی کا بیان اعظم دیدہ مری کے قریب معلوم ہوتا ہے۔ وہ دوسرے مورخین سے اختلاف کرتے ہوئے للہ دید کی پیدائش کا زمانہ سلطان علاؤالدین کے دورِ حکومت کا زمانہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"وہ (للہ) تقریباً" مسیح کی چودھویں صدی کے وسط میں سلطان علاؤالدین کے عہدِ حکومت میں پیدا ہوئیں" [۲]

یہ بات قابلِ غور ہے کہ سلطان علاؤالدین کا زمانۂ حکومت ۱۳۴۳ء سے ۱۳۵۴ء رہا ہے۔ پروفیسر جے لال کول نے اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اپنے ایک مضمون میں انہوں نے بھی ۱۳۳۵ء [۳] کو للہ کی پیدائش کا سال بتایا ہے

---

[۱] ہمارا ادب مشاہیر نمبر (۷۶-۷۷) ص ۱۶

[۲] ہسٹری آف کشمیر ص ۳۵۹

[۳] STUDIES IN KASHMIRI P: 171

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

لیکن ایک اور جگہ وہ خود اپنی تصنیف میں تردید کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا یہ بیان قابلِ غور بن جاتا ہے :-

"للہ دید کی تاریخ پیدائش ۱۳۱۷ء اور ۱۳۲۰ء کے درمیان کسی بھی وقت تسلیم کی جا سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے قبل بھی ہو لیکن کسی بھی طرح ۱۳۲۰ء کے بعد نہیں ہے۔" [۱]

اس افراط و تفریط کے عالم میں للہ دید کی پیدائش کی تاریخ کے بارے میں قطعیت کے ساتھ فیصلہ کرنا ناممکن ہے۔ یہ بات البتہ یقینی ہے کہ للہ نے چودھویں صدی کے دوسرے یا تیسرے دہے میں جنم لیا۔ اور یہ زمانہ راجہ اودین دیو یا اُس کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ ہندو راج نزع کی حالت میں تھا۔ نئی صدی کے آغاز سے کئی انقلابات رونما ہوئے جن کے دوررس نتائج نکلے اور جن سے کشمیر کی ساری تاریخ بدل گئی۔ راجہ سہدیو (۱۳۰۱-۱۳۲۰) وسط ایشیا کے ایک قبائلی سردار کے حملے سے پسپا ہو کر ملک سے بھاگ کھڑا ہوا۔ رینچن (۱۳۲۰-۱۳۲۳) اودین دیو (۱۳۲۳-۱۳۳۸) اور کوٹا رانی (۱۳۳۸-۱۳۳۹) کی حکومتیں برائے نام ثابت ہوئیں اور ہندو راج کے اثرات آہستہ آہستہ ختم ہونے لگے۔ اس موقعے پر شاہ میر اپنی پوری طاقت اور حکمت عملی کے ساتھ نمودار ہوا۔ اور اُس نے کوٹا رانی کو تخت سے ہٹا کر حکومت کی عنان خود سنبھالی اور باقاعدہ طور پر اسلامی حکومت کا آغاز ہوا۔ للہ ایشوری کی پیدائش کا کم و بیش یہی زمانہ ہے۔ اس کے بعد وہ کافی طویل عمر تک زندہ رہی اور کئی مسلمان حکمرانوں کا زمانہ دیکھا۔

---

[۱] لل دید ص: ۷

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

للہ موجودہ سرینگر سے کوئی چار میل دور پاندریٹھن میں پیدا ہوئیں جو مہاراجہ اشوک نے راجدھانی کے طور پر آباد کیا تھا اور ایک عرصہ تک پران ادھشٹان (پرانا شہر) کے نام سے مشہور تھا۔ ان کے والد کا نام تزندرہ بٹ تھا جو ایک متمول کشمیری پنڈت زمیندار تھے۔ کئی مورخوں کا خیال ہے کہ وہ پانپور کے نزدیک سیم پورہ نام کے گاؤں کے رہنے والے تھے۔ للہ نے اپنی خاندانی روایات کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کے کُل گورو سدھ سری کنٹھ المعروف سدھ مول ایک نامی گرامی عالم اور فاضل تھے اور انہیں ترکہ فلسفے پر عبور حاصل تھا۔ وہ خود بھی ایک یوگی اور پاک نفس بزرگ تھے۔ للہ نے روحانی اور دینی تعلیم کے ابتدائی اسباق ان ہی سے حاصل کئے۔ اپنے گورو کی تعلیمات کو للہ نے گہرے انہماک سے سیکھ لیا اور نہایت ہی سنجیدگی اور بصیرت کے ساتھ جذب بھی کر لیا۔ بعد کے برسوں میں جب للہ کا شعور پختہ ہوا اور اُن کو گیان و عرفان کی بیش بہا دولت حاصل ہوئی تو وہ اپنے چیلے کے کشف و کمال اور بصیرت اور آگہی کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔

للہ کی شادی کم سنی میں ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ابھی بارہ سال کی بھی نہ ہوئی تھیں کہ اُن کا ہاتھ پدمان پور (موجودہ پانپور) کے ایک برہمن زادے کے ہاتھ میں دیا گیا۔ یہاں للہ کا نام پدماوتی رکھا گیا۔ پدماوتی کے لئے زندگی کا یہ موڑ نہایت اہم ثابت ہوا۔ بچپن کے الہڑپن کا زمانہ بیت چکا تھا اور ازدواجی بندھنوں کی ذمہ داریاں نہایت ہی کم سنی میں شروع ہوئیں۔ سسرال ایسا ملا جہاں دُور دُور تک امن و سکون کا گذر بھی نہ تھا۔ کنوارپن میں جو شاداب اور پُر سکون بچپن دیکھا تھا اس کی ساری لطافت اس کا سارا حُسن اور اس کی ساری رعنائی سسرال کے تپتے ہوئے ریگزار میں خاکستر ہوئی۔ اجنبی ماحول، تند مزاج اور ظالم ساس

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کی سفاکی، لاپرواہ اور کٹھور شوہر کی بے اعتنائی اور سب سے بڑھ کر قدامت پرستی کے حصار ـــ قدم قدم پر احتساب، پل پل ٹھوکریں، بات بات پر طعنوں کی کسیلی فضا حتیٰ کہ عصمت شعاری پر مشکوک سرگوشیاں ـــ کم سن، تنہائیوں کی عاشق، باطن کے بے نام درد کی ہلکی ہلکی ٹیسوں سے بے چین پدماوتی ـــ اس محبوس فضا میں گھٹن محسوس کرنے لگی لیکن بچپن سے جو صبر، ضبط اور ایثار کا جہیز وہ ساتھ لے آئی تھی اس کے سہارے سسرال کی اس تند آندھی کا مقابلہ کرنے لگی۔ ساس کے سفاک روّیے اور شوہر کی بے مُروّتی نے گداختگی میں اضافہ کیا۔ وہ نہایت خاموشی سے اس غیر انسانی سلوک کو برداشت کرتی رہی۔ دن بھر کی گرہستی کے کام کے بعد پیٹ کے لالے پڑنے لگے۔ بھات کی تھالی میں پتھر کے ڈھیلے ملے لیکن زبان نے اُف بھی نہ کی۔ ایسی صورت حال میں جب سہیلیوں نے حال پوچھا تو بے اختیار صرف اتنا کہہ سکی ـــ

ہۆنڈ مٲری تن کِنہٕ مٲری تَن کٔٹھ
لَلہِ نلہِ وَٹھ ژلِہ نہٕ زانٛہہ

(بھیڑ ذبح ہو یا مینڈھا، للہ کے مقدر میں پتھر کا ڈھیلا ہی ہے)

روایت میں لپٹی ہوئی بے شمار کہانیاں للہ کی زندگی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ روز صبح سویرے دریا سے پانی لے آتی تھی اور اسی بہانے تھوڑی دیر کے لئے مندر میں چلی جاتی تھی اور پوجا سے فارغ ہو کر پانی کا بھرا ہوا مٹکا دریا سے لے آتی تھی۔ ایک روز بپھرا ہوا شوہر راستے میں ملا اور بہانہ تراش کر مٹکے کو چھڑی کی ضرب سے توڑ دیا۔ مٹکا ٹوٹ گیا لیکن پانی پدماوتی کے کندھے پر جما رہا جو چند ایک قطرے زمین پر گر پڑے ان میں سے ایک چشمہ پھوٹا جو آج تک لل تراگ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کے نام سے مشہور ہے اور جس میں ابھی حالیہ برسوں تک پانی موجود تھا۔ اس واقعے سے نہ صرف للہ کا شوہر مبہوت رہ گیا بلکہ اُن کی پُر اسرار شخصیت کا جادو لوگوں پر نقش ہوگیا۔ پدماوتی کے صبر کے سب بند ھ ٹوٹ گئے۔ اندر کی آگ بھڑک اُٹھی۔ ذوقِ جنون کو ہوا لگ گئی اور اپنے ان دیکھے پیا کے برہ نے مستی اور فقر کے لئے راستہ صاف کیا۔ پدماوتی نے دامن چاک کیا اور حق و صداقت کے سرچشموں کی تلاش اپنا مسلک بنالیا اور یہیں سے ان کی زندگی کا اصلی سفر شروع ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۵ سال کے لگ بھگ تھی۔ اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پریم ناتھ بزاز رقم طراز ہیں :-

> " اس کی ازدواجی زندگی کے زیادہ سال نہیں گذرے تھے جب للہ نے اپنے رشتوں، ناطوں کو ترک کرکے انسانی کنبے میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ وہ نوجوان تھی۔ غالباً اس کی عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ جب اُس نے گھریلو بندھنوں کو توڑ کر حق کی تلاش شروع کی ۔" [1]

للہ اپنے جس معبود کی تلاش میں گھر بار چھوڑ کر دیوانہ وار گھومنے لگی اس کی ہر ادا اس کو بھاگئی تھی اور اس کے پیار کی کسک کو مدتوں سے اس نے اپنے دل کے نہاں خانوں میں دستک دیتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ بچپن میں جو چنگاری بھڑک اُٹھی تھی، وہ اب ایک شعلہ بن چکی تھی۔ من مندر کی اس جوت کا احساس اس نے ایک بار اس طرح دلایا :-

---

[1] DAUGHTER OF VITASTA PAGE 127

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

آلِس تہٕ سیۆدُے گژھ تہٕ سیۆدُے
سیٚدِس ہۆل مےٚ کرٕ ہم کیشاہ
بہٕ تس آسِس آگرٕے وینژی
ؤیدِس تہٕ ویٚشدِس کرٕہم کیشاہ

(میں راہِ راست سے چلی آئی اور اسی طرح چلی بھی جاؤں گی
وہ مجھے ازل سے جانتا ہے مجھ جانی پہچانی کو کوئی کیا کرے)

لیکن پھر ایسے میں کبھی کبھی اُسے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا رہا۔ اس بات کے باوجود کہ معبودِ حقیقی کا پیار اُس کی نس نس میں رچا ہوا ہے اور وہ اس کے پیار کی دیوانی ہے لیکن اپنے میں اس قدر سکت نہیں پاتی کہ اس من موہنی صورت کا سامنا کرے۔ پیا کے گھر کا سفر طویل ہے۔ جیب خالی ہے۔ بحرِ بیکراں سامنے پڑا ہے۔ اس تُند اور اتھاہ سمندر کو کیسے پار کرے اور اپنے پیا سے جا ملے۔ اعتماد کی اس کمی کا احساس للہ یوں دِلاتی ہے

آئیس وَتے گئیس نہٕ وَتے
سُمن سوتھِ مَنٛزٕ لوٗسُم دوہ
چَنٛدس وُچھُم تہٕ ہار نہٕ اَتے
ناوِ تارِس دِمہٕ کیاہ بوہ

(سیدھے راستے سے چلی آئی۔ لیکن واپسی کا راستہ بھول گئی
ندی کے کنارے تک آتے آتے، شام ڈھل گئی —
جیب خالی ہے، ملاح کو کیا دوں کہ نیّا پار لگا دے)

[illegible] سے آزاد ہو کر للہ اپنے پیا کی تلاش میں سال ہا سال

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تک سرگرداں رہی۔ برہ کی آگ نے اسے مجذوب بنا دیا۔ وہ غاروں، بیابانوں، جنگلوں اور بستیوں میں ایک آوارہ گرد کی طرح گھومنے لگی۔ ظاہری وجود سے بے نیاز نہ تن ڈھانپنے کا غم اور نہ پیٹ پالنے کی پریشانی، ننگ دھڑنگ، دیوانی، وفورِ جذبات سے نڈھال گاتی اور ناچتی رہتی، پیٹ کا نچلا حصہ آہستہ آہستہ نیچے سرک گیا اور پوشیدہ اعضا پر ستر کا کام کرنے لگا۔

اسی مستی کے عالم میں جب لوگ اسے دیوانی کہتے تھے وہ فرزانگی کی اعلیٰ منزل میں آ گئی تھی اور اپنے مخصوص آہنگ کے ساتھ اپنی روح کا درد اور اپنی تلاش کی کسک، "واکھیوں" کی صورت میں ڈھالنے لگی۔ یہی "واکھ" آج کشمیری شاعری کا سر آغاز تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کے پس پُشت ایک ایسی شخصیت کا بھرپور احساس سامنے آجاتا ہے جس پر گیان و عرفان کے خزانے وا ہو چکے ہوں۔ جس میں بصیرت اور آگہی کی نہ بجھنے والی جیوت جھلملاتی ہے۔ للّہ نے اپنے گورو سِدھ شری کنٹھ سے جو گورو اُپدیش پایا تھا۔ اس کی روشنی ہی میں للّہ نے اپنے لئے ایک نیا راستہ تراش لیا۔ اپنی دیوانگی اور مستی کا راز اپنے ایک واکھ میں یوں بیان کیا ہے۔

گورن دۆپنم کُنُے وَژُن
نێبر دۆپنم اَندر اَژُن
سُے ہا مالہِ گوم واکھ تہ وَژُن
تَوَے ہیۆت مےٚ نَنگے نَژُن

(میرے گورو نے مجھے اُپدیش دیا۔ کہا باہر کی دُنیا سے من کی دُنیا میں چلی آؤ، اسی اُپدیش نے میری کایا پلٹ دی اور میں عریاں ہو کر ناچنے لگی)۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

للہ نے اپنے گیان و عرفان کی آگہی سے پہلے سدھ مری کنٹھ کے علاوہ کئی برہمن عالموں سے عارفانہ مناظرے کئے۔ تلاشِ حق اور ذوقِ جستجو کو آگہی کی بھٹی میں تپا کر کندن بنا دیا۔ اپنے نفس کی پاکیزگی اور تیاگ کی صداقت سے عرفان کی ارفع منزلیں حاصل کر لیں۔ حتیٰ کہ اپنے گورو سے جو شیومت کے فلسفے کا زبردست عالم تھا۔ کئی لحاظ سے آگے بڑھ گئی اور کئی مقامات ایسے بھی آئے جب گورو کو اپنے مرشد کے سامنے لاجواب ہونا پڑا۔ اسی زمانے میں جیسا کہ پہلے ذکر ہوا للہ کی ملاقات کئی مسلمان عالموں فاضلوں اور مشائخین کے ساتھ ہوئی جن میں سید جلال الدین بخاری رح، سید حسین سمنانی رح سید میر علی ہمدانی جیسی برگزیدہ شخصیتوں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان سے عارفانہ باتیں ہوتیں۔ ان ملاقاتوں کے سلسلے میں کئی روایتیں بیان کی گئی ہیں جن کا یہاں محل نہیں ہے ۔۔ لیکن یہ بات تسلیم کرنا ہوگی کہ ان ملاقاتوں کے دوران بہت سی باتوں کا ردّ و قبول ہوا۔ للہ نے بار بار اپنے واکھوں میں اپنے مسلک کی وضاحت کی ہے اُنہیں نہ اندھ وشواس پر یقین تھا نہ بت پرستی اور مورتی پوجا پر۔ وہ ہوا دوں اور بے معنی رسم و رواج کے خلاف تھیں۔ ان کا سب سے بڑا مسلک شِو یعنی خُدا کی تلاش تھی اور اس کے بعد اس کی ذات میں مدغم ہونے کی تڑپ ۔۔ وہ اس دُنیا سے نکل کر نجات حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ وہ معرفت کی اس منزل پر پہنچ چکی تھیں جہاں ہندو اور مسلمان، رنگ اور نسل، ذات اور خاندان کا کوئی بھید بھاؤ نہیں۔ سب سے بڑی دولت اپنے آپ کو شناخت کرنا ہے اور اسی سے شو (خُدا) کو پایا جا سکتا ہے۔ اسی لئے کہتی ہیں :۔

شِو چھُے تھَلِہ تھلِہ روزان
موزان ہیٛنوٛند تہٕ مُسلمان

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تۄہ کے چھکھ تہٕ پیٚنہٕ نے پان زان
اَدٕ چھے صاحبس سیتھ زٲنی زان

(شِو (اللہ) ہر جگہ موجود ہے۔ ہندو اور مسلمان کے بھید بھاؤ سے پرہیز کرو۔ اگر ذہن رسا ہے تو اپنے آپ کو پہچان جبھی خدا کی شناخت ہو گی)

للہ نے اپنے روحانی تجربوں کے اظہار کے لئے نظم کا میڈیم استعمال کیا۔ یہ میڈیم ان کے واکھ ہیں اور ان سے ہی کشمیری زبان کی شاعری کا صحیح معنوں میں آغاز ہوتا ہے۔ للہ کی روحانی عظمت سے قطع نظر جب ہم اُن کی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک عظیم شاعرہ ہیں۔ ان کے سامنے کوئی روایتی تجربہ یا نمونہ بھی نہیں لیکن پھر بھی وہ اپنی بات کہنے اور منوانے کا سلیقہ رکھتی ہیں۔ للہ کی زبان اس وقت کی عام کشمیری زبان ہے۔ اس میں صداقت اور حُسنِ بیان کی دلیل ہے۔ جبھی ان کے واکھ زبان زد عام ہیں۔ للہ نئے نئے استعاروں سے خوبصورت پیکر تراش لیتی ہیں اور ان پیکروں سے معنی کی پرتیں کھُل جاتی ہیں۔ یہ بلیغ اور بامعانی واکھ زندگی کی کتنی ہی مشکلوں کے لئے سہولیت کے دروازے کھول دیتے ہیں اور توہمات اور تعصبات کے گھور اندھیروں میں کھوئے ہوئے انسانوں کی روشن مارگ کی سمت بتلاتے ہیں۔ للہ ترکہ فلسفے کی رازدان ہیں۔ ان کے نزدیک اللہ اور ایشور ایک ہیں۔ اس لئے وہ کرٹ برہمنیت اور کرٹ ملائیت کے تانے بانے کو کاٹ کر من کی دنیا میں سُراغ زندگی کی نشاندہی کرتی ہیں۔ پوجا پاٹھ، دیر و حرم اور مندر و خانقاہ تو صرف ظاہری مذہب کی علامتیں ہیں۔ اس سے گیان اور آگہی کی منزلیں شاید ہی مل سکیں۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اصلی گیان تو باطن کا نور ہے۔ خودی کی شناخت ہے جہاں سے ازلی نور میں جذب ہونے کی راہ نظر آتی ہے۔ کہتی ہیں :

گگن ژٕ پے ، بھوتل ژٕ ہے
ژٕ ے چھکھ دِہن پون تہٕ راتھ
ارگ ژٕندن پوش پونی ژٕ پے
ژٕ پے چھکھ سورُے لاگی نہٕ کیاتھ

(میرے معبود! تم ہی آکاش ہو اور تم ہی پرتھوی ہو۔ تم ہی دن اور تم ہی رات ہو۔ تم ہی چندن اور پھول اور پانی ہو تم ہی سب کچھ ہو، میں تمہاری پوجا میں کیا چڑھا دوں)

للہ ایشوری نے کسی مت کی بنیاد نہیں ڈالی۔ اُن کا کوئی پیروکار تھا نہ چیلوں کی کوئی ٹولی۔ لیکن انہوں نے جس فلسفے اور پیغام کو لوگوں تک پہنچا دیا۔ اس کی جڑیں دُور دُور تک پھیل گئیں۔ للہ کشمیر کی ادبی تاریخ میں ایک بنیادی سی حیثیت رکھتی ہیں اس لئے اپنی روحانی حیثیت سے قطع نظر ان کی ادبی حیثیت بھی ہمیشہ تابندہ رہے گی۔

للہ نے طویل عمر پائی۔ ان کی پیدائش ہی کی طرح ان کی موت بھی مورخین میں اختلافی مسئلہ رہا ہے۔ صوفی کا خیال ہے کہ للہ نے آخری عمر میں اسلام قبول کیا تھا[1] ان کے انتقال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

للہ کافی بڑھاپے میں بیج بہاڑہ میں وفات پاگئیں جو سرینگر کے

---

[1] کشیر جلد دوم ص ۳۸۵۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

جنوب مشرق میں ۲۸ میل کے فاصلے پر ہے۔ جامع مسجد میں جنوبی مشرقی کونے پر آج بھی اس کے مزار کی نشاندہی کی جاتی ہے"۔[1]

لیکن للہ کے اسلام قبول کرنے کی سند کسی بھی تاریخی یا نیم تاریخی دستاویز میں نہیں ملتا۔ مورخ حسن للہ کی وفات ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

"مورخوں میں سے کوئی اس کی وفات کا قائل نہیں۔ مشہور ہے ایک دن بیج بہاڑہ کی جامع مسجد کی دیوار کے پیچھے بیٹھی تھی اور اچانک آگ کے شعلے کی طرح چمک اٹھی اور یہ شعلہ فضا میں اوپر جا کر نظر سے غائب ہوگیا۔ اس کے بعد للہ عارفہ کو کسی نے نہیں دیکھا"۔[2]

آزاد نے اپنی کتاب "کشمیری زبان اور شاعری" میں محمد الدین فوق کے حوالے سے اس سلسلہ میں یوں لکھا ہے:-

"انگریز مفسر اس کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جب اس کی روح اس کے قفس عنصری سے نکلی تو وہ ایک شعلہ کی طرح بھڑکی اور ہوا کی طرح جسم سے نکل کر غائب ہوگئی۔ یہ واقعہ بیج بہاڑہ میں پیش آیا۔ لیکن اس کا جسم کہاں گیا اس کے متعلق انگریز مفسر بھی خاموش ہے"۔[3]

صوفی کی کتاب میں جس مقبرے کا ذکر آیا ہے۔ انگریز مفسر کے یہاں اس

---

[1] کشیر جلد دوم ص ۳۸۵

[2] تاریخ حسن (تذکرہ اولیائے کشمیر) تیسرا حصہ۔ ص ۳۴۹

[3] کشمیری زبان اور شاعری جلد دوم ص ۱۲۵ — ۱۲۶

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ دوسرے مورخین بھی اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ اس کی وفات کا ذکر بھی روایات میں لپٹا ہوا ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ للہ دید ایک بڑے مٹی کے برتن میں بیٹھ گئیں اور دوسرا برتن اپنے سر پر رکھا اس کے بعد دو برتنوں کے درمیان اپنے آپ کو چھپا لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب برتن ہٹایا گیا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس طرح سے للہ دید اپنے معبود کے ساتھ جا ملیں۔ پروفیسر جے لال کول لکھتے ہیں:-

"للہ دید اپنے پیچھے کوئی نشان چھوڑے بغیر سورگباش ہوگئیں۔ حیرانی کی بات ہے کہ ان کی آخری آرام گاہ پر نہ کوئی سمادھی تعمیر ہوئی ہے اور نہ کوئی مقبرہ۔"

پروفیسر موصوف نے سورگباش ہونے کے وقت للہ دید کی عمر لگ بھگ ۷۱ برس کی بتائی ہے اور سن وفات ۱۳۸۸ اور ۱۳۹۹ کا کوئی درمیانی عرصہ بیان کرتے ہیں۔ للہ دید کی قد آور شخصیت کے ارد گرد پُراسراریت کا جو ہالہ کھینچ لیا گیا ہے اس سے اس کی حقیقت افسانویت میں ڈھل گئی ہے۔ مگر حق بات تو یہ ہے کہ للہ ایک حقیقت ہے، زندہ اور تابندہ، اور کشمیر کو ان کی ذات بابرکات پر ہمیشہ ناز رہے گا۔

●●

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پیر پنڈت پادشاہ

جھر جھر کرتے ہوئے جھرنوں، سفید برف سے ڈھکے ہوئے پربتوں اور اونچے پیڑوں سے لدے ہوئے سنسان جنگلوں کی یہ دُنیا سالہا سال سے اہلِ نظر کو دعوت نظارہ دیتی رہی ہے۔ لیکن قدرت کے روپہلے سالوں میں جھولتی ہوئی اس سدا بہار سہاگن نے روحانیت اور معرفتِ حق میں ڈھلے ڈھلائے کتنے لال جنے ہیں جن کے گیان اور عرفان نے ایک دنیا کو موہیت کر لیا ہے۔ پنڈت ریشہ پیر، پیر پنڈت پادشاہ اسی برادری سے تعلق رکھتے ہیں، جس کی فہرست میں للہ وید، شیخ العالم، روپہ بھوانی میرزا کاک، جیون صاحب، میشا صاحب اور ایسے ہی بے شمار لوگ شامل ہیں۔ پنڈت پیر آج سے کوئی چار سو سال قبل، اپنے روحانی کمال، اپنے کشف و کرامات اور اپنی زبردست تپسیا کے جوہر دکھلا چکے ہیں اور آج تک برابر عقیدت مندوں کا سلسلہ بڑھتا چلا آیا ہے۔ بہت پہلے اردو کے مشہور انشا پرداز اور شاعر پنڈت رتن ناتھ سرشار نے فخر سے کہا تھا :-

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہم لوگ ہیں برہمنانِ کشمیر   اولادِ حضور شاہ ریشہ پیر
بدلیں علیسائیوں کا سا بھیس   اور جا کے رہیں ملیکش کے دیس[1]

پیر پنڈت کی ذاتِ اقدس کے ساتھ والہانہ وابستگی نے ایک اور جگہ سرشار سے
ایک رباعی کہلوائی تھی :-

مداح جناب ریشہ پیر آتا ہے   وصاف شہِ عرش سریر آتا ہے
خورشید کی آنکھ کیوں نہ جھپکے سرشار   ہاں ذرۂ خاک کاشمیر آتا ہے[2]

سرینگر شہر میں عالی کدل پل سے ذرا آگے ایک تنگ و تاریک گلی کے اندر
دو چناروں کی چھاؤں میں ایک یک منزلہ مکان نظر آتا ہے یہیں پنڈت ریشہ
پیر کا حجرا ہوا کرتا تھا اور یہ گلی اب تک اُس درویش باکمال کے نام پر کوچۂ
ریشہ پیر کے نام سے موسوم ہے۔ آج تقریباً چار سو سال کا عرصہ بیتنے کے باوجود
کتنے ہی عقیدت مندوں کے سر روز یہاں جھک جاتے ہیں اور دل ہی دل میں
اُس مجذوب قلندر کی روح کو سلام کہتے ہیں۔

پنڈت ریشہ پیر ۱۶۳۷ء کو لبساکھ کرشن پکش کی سرشٹما کو پنڈت گوبند جو
نشو نام کے ایک متمول کشمیری پنڈت کے ہاں پیدا ہوئے تھے۔ پنڈت گوبند جو کی شادی کسی
وجہ سے جوانی کے زمانے میں نہ ہو سکی تھی۔ بڑی تگ و دو کے بعد آخر ہندواڑہ تحصیل
کے گشی نام کے گاؤں میں ان کا رشتہ طے ہوا۔ اور وہ محض اپنی دولت کے سہارے ایک
غریب گھرانے کی نیک سیرت لڑکی بیاہ لائے۔ کشمیر کے مشہور مورخ حسن   اپنی

---

[1] بہار گلشن کشمیر جلد دوئم   مولفہ برج کشن کول بے خبر و جگ موہن رینہ شوق ص ۱۲۹

[2] بہار گلشن کشمیر جلد دوئم مولفہ برج کشن کول بے خبر و جگ موہن رینہ شوق ص ۴۰۴

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تاریخ ،"تاریخ حسن" (تذکرہ اولیاءِ کشمیر) میں پنڈت پیر کے والد کے بارے میں مورخانہ تسامح کا شکار ہوتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ پنڈت گوبند جو گشی کے رہنے والے تھے اور ان کی شادی سرینگر میں ہوئی تھی۔ چنانچہ لکھتے ہیں :-

"اُن کا باپ پرگنہ اوتر کے ایک گاؤں گشی کا باشندہ تھا جو اُن کے پیدا ہونے سے پہلے مر گیا تھا۔ ان کی ماں رنگ ٹینگ کے ایک پنڈت گھرانے کی لڑکی تھی۔" [1]

یہ بیان حقیقت سے بعید ہے۔ دراصل پنڈت گوبند جو خشو بٹہ یار رنگہ ٹینگ کے رہنے والے تھے، دولتمند تھے اس لئے ڈھلتی عمر کے باوجود گشی (ہندواڑہ) سے دلہن بیاہ لائے۔ لڑکی کی ماں اپنے داماد کے بڑھاپے کو دیکھ کر دم بخود ہوگئی۔ لیکن اب "ہونی" کو کیسے مٹایا جا سکتا تھا۔ کافی دنوں تک جب بیٹی کے کوئی بچہ نہ ہوا تو ممتا کی ماری ماں آنسو بہاتے ہوئے بھگوان کے کرم کے سامنے جھولی پھیلانے لگی۔ گاؤں کی بغل میں ایک چشمہ تھا جس کے ساتھ آرزومندوں کی کتنی ہی آرزوئیں وابستہ تھیں [2]۔ پنڈت گوبند جو کی ساس بھی اپنا پرالتجا کرنے کے لئے اُس چشمے پر آیا کرتی تھی جہاں آرزومندوں کی بھیڑ لگا کرتی تھی۔ روایت ہے کہ ایک روز پو پھٹنے سے پہلے بوڑھی ماں چشمے کے کنارے، آنسو کے موتی رولتی ہوئی اپنی بیٹی کے لئے دعا مانگ رہی تھی کہ اچانک غیب سے آواز آئی۔

---

[1] تاریخ حسن حصہ سوم (تذکرہ اولیائے کشمیر) ص ۵۸۴

[2] اس چشمے کے بارے میں ایس۔ این چراغی مصنف "جیون چرتر رشی پیر" نے لکھا ہے:-

"اس کنڈ کے دیوتا کی نسبت یہ مشہور تھا کہ وہ خوش ہونے پر اپنے بھگتوں کے دامنِ مراد گوہر مقصود سے بھر دیتا تھا۔" (جیون چرتر رشی پیر ص۱۱)

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

"اے بوڑھی میا! تمہاری آواز بارگاہِ حق میں سُنی گئی ہے۔ تم کل اسی وقت یہاں اپنی بیٹی سمیت چلی آؤ، تمہیں ایک گل دستہ ملے گا۔ تمہاری بیٹی ان پھولوں کو سونگھ لے تو اس کے من کی مراد پوری ہوگی۔" چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ دوسری صبح ماں بیٹی سمیت چشمے پر حاضری دینے آئی۔ چشمے سے ایک گلدستہ برآمد ہوا۔ بیٹی نے سونگھ لیا۔ چند روز کے بعد اُس پر یہ بات آشکار ہوئی کہ وہ پیٹ سے ہے۔ سال بھر کے اندر اس کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا جو آئندہ برسوں میں ریشہ پیر کے نام سے مشہور ہوگیا۔ پنڈت پیر کی اس معجزاتی پیدائش کے پیشِ نظر آج تک پیر گھرانوں میں ان کو "ناگہ پوتھر" یعنی چشمے کا بیٹا کہا جاتا ہے۔

پنڈت پیر کی پیدائش کے بارے میں مورخ حسن سے بھی چوک ہوئی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ ریشہ پیر کی پیدائش پنڈت گوپند جو کے انتقال کے بعد ہوئی تھی لکھتے ہیں :۔

"اُن کا باپ پرگنہ اوتر کے ایک گاؤں گشی کا باشندہ تھا۔ جو اُن کے پیدا ہونے سے پہلے مرگیا تھا۔" [۱]

ریشہ پیر کا اپنے والد کے انتقال کے بعد پیدا کرنا کسی اور ماخذ سے معلوم نہیں ہوتا۔ حضرت دلبر کاشمیری اپنی کتاب سالکانِ کشمیر و ہند میں رقمطراز ہیں :۔

"آپ پنڈت گوپند جو خوشبہ یار کے فرزند تھے۔ بچپن میں ہی پتا کا سایہ اُٹھ گیا۔" [۲]

ایس، این، چراغی اپنے کتابچے میں لکھتے ہیں :۔

---

[۱] تاریخ حسن حصہ سوم (تذکرہ اولیائے کشمیر) ص ۵۸ ۴

[۲] سالکانِ کشمیر و ہند المعروف سنت مالا حصہ اول و دوم ص ۵۹

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

"شادی کے لعد پیر پنڈت کو ایک بھاری صدمہ پیش آیا اور گوبند جو راہی ملک بقا ہوئے۔" [1]

ان بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پنڈت پیر کے والد اُن کے بچپن میں، جب وہ اپنے بیٹے کا بیاہ رچا چکے تھے، رحلت کر گئے۔

ریشہ پیر کی پیدائش کے بارے میں بھی ایک عجیب واقعہ بیان کیا جاتا ہے ـــ روایت ہے کہ ریشہ پیر کی والدہ سولپور سے سرینگر کشتی میں سوار ہو کر آ رہی تھیں [2] کہ سولپور کے مقام پر کشتی میں ہی اُن کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ چونکہ بچے کی پیدائش ناگ ریشی کی دُعا سے ہوئی تھی اس لیے اس کا نام "ریشہ" مقرر ہوا۔ سولپور میں اُن کی پیدائش کی تصدیق مورخ حسن نے اپنی تاریخ میں یوں کی ہے :۔

"سولپور میں ہی کشتی میں ریشہ پیر کی پیدائش وقوع میں آئی۔" [3]

کہا جاتا ہے کہ سولپور کے نواحی علاقے میں ایک سادھو ہڑبڑا کر نیند سے جاگ اُٹھا اور یہ کہا کہ کہیں پاس ہی ایک سورج چمک اُٹھا ہے۔ سادھو پہنچا ہوا بزرگ تھا۔ لوگ بھاگ تلاش میں دوڑے۔ آخر پتہ چلا کہ کشتی میں ایک بچے نے جنم لیا ہے۔ سادھو خود شوق سے بچے کو دیکھنے گئے اور اسے دیکھ کر بچے کی ماں کو بشارت دی کہ تمہارے گھر میں ایک سورج نے جنم لیا ہے۔

سرینگر میں گوبند بھٹ نے اپنے بیٹے کو نازوں سے پالا۔ زمانے کے رواج

---

[1] جیون چرتر ریشہ پیر ص ۷

[2] اُس زمانے میں رسل و رسائل کے لئے کشتیوں کا سب سے زیادہ استعمال ہوتا تھا۔

[3] تذکرہ اولیائے کشمیر ۴۸۲

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کے مطابق پاٹھ شالہ کی تعلیم دلائی۔ منا رشیہ پڑھنے لکھنے میں اپنے ہم سبقوں سے پہلے آگے تھا
بچپن میں ہی بوڑھے باپ نے اکلوتے بیٹے کی شادی رچائی۔ چند سال کے بعد پنڈت گوبند جو
انتقال کر گئے اور بے چاری بہو سبز قدم ٹھہرائی گئی۔ رلیشہ کے والد جب تک حیات تھے اپنی
عاقبت سدھارنے کے لئے ہر روز ہاری پربت چکریشور[1] کا طواف کرنے جایا کرتے تھے۔
چھوٹا رلیشہ بھی اکثر ان کے ساتھ ہوتا۔ اس طرح بچپن سے ہی رلیشہ کے دل میں دھرم اور اعتقاد
کی جوت جلی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد آہستہ آہستہ دنیا کے معاملات سے ان کی دلچسپی
کم ہونے لگی اور آخروی مسائل کی طرف رغبت بڑھنے لگی۔ والد کی موت کے بعد یہ ذوق اور بھی
نکھر گیا۔ اُن کے اندر کوئی غیر مرئی طاقت اُنہیں جھنجھوڑنے لگی۔ اُن کا سکون لُٹ گیا
اور وہ ایک تشنہ لب کی طرح پیروں، فقیروں، سادھوؤں اور سنتوں کی صحبت میں ڈولتے
ہوئے نظر آئے۔ کبھی کبھی دُور اور نزدیک کے مقدس مقامات کی سیاحت کرتے ہوئے
دیکھے جانے لگے۔ اُن کی حالت دیوانوں کی سی تھی۔ ماں اپنے بیٹے کی اس حالت سے نالاں
رہنے لگی، اُس نے بیٹے کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔ اُسے یہ بتایا کہ وہ ایک کنبے
کا سربراہ ہے ایک بیوی کا شوہر ہے اور ایک بیوہ ماں کی آنکھ کا نور ہے لیکن رلیشہ، برہ
کی اگنی میں جلا ہوا۔ ایک ازلی عاشق بھلا ان باتوں کی کیا پرواہ کرتا۔ سادھوؤں اور
سنتوں کی صحبت میں جب سکون نہ ملا تو کٹھن تپیا شروع کر دی۔ وہ دیوی شارلیکا کے
بڑے بھگت تھے۔ اُن ہی کی اپاسنا سے من کو شانت کرنے لگے۔

---

[1] ہاری پربت صدیوں سے کشمیری پنڈتوں کا مقدس مقام ہے۔ اس پہاڑ کی چاروں
طرف جگہ جگہ ہندوؤں کے استھاپن اور مندر ہیں۔ اس لئے اس پہاڑی کے گرد پنڈت
لوگ طواف کرنا اپنی سعادت سمجھتے ہیں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ایس۔ این چراغی لکھتے ہیں:۔

"اس کے بعد پنڈت اپنا سارا وقت ہاری پربت میں دیوی کے چرنوں میں گذارنے لگے۔ ان کی والدہ نے انہیں بہتیرا سمجھایا کہ وہ دنیاوی کاروبار کو اپنائے لیکن روحانیت کے سمندر میں ڈوبے ہوئے پیر پنڈت پہ اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔"[1]

ماں نے انہیں کسی طرح اپنے میکے گشی بھجوا دیا۔ وہاں تیاگ اور تپسیا کے راستے سے ہٹانے کے لئے ان پر کڑی نگرانی ہونے لگی لیکن وہاں سے بھاگ آئے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تنگ آکر ایک دن شراپ دیا تھا:۔

گشی شےٖ ریتھ لُیشی

(گشی والوں کو صرف چھ ماہ کا کھانا ملے)

اور عرصہ دراز تک گشی والوں کو زمین صرف اتنا اناج دینے لگیں جو سال بھر کے بجائے صرف چھ ماہ کی کفالت کرتا۔ سرنگر آکر انہوں نے چالیس دن تک گھٹنوں کے بل چکر لیشور ہاری پربت کے گرد طواف کیا۔ چالیسویں دن دیوی نے بشارت دی کہ ہاری پربت کے پچھواڑے میں جو شخص سب سے پہلے ملے گا وہی ان کا گرو ہے اور وہی اُن کے لئے اصلی منزل کی نشاندہی کرے گا۔ روایت ہے کہ یہ شخص مشہور مستانہ جوگی پنڈت کرشنہ کار تھے جنہوں نے تمباکو کے ایک کش کے ذریعے اُن پر ازلی حقیقت آشکار کردی۔ پنڈت کرشنہ کار سے ان کی مڈبھیڑ ہاری پربت کے پچھواڑے میں ہی ہوئی لیکن ریشہ پیر نے اس مست جوگی سے یہاں نہ کچھ کہا اور نہ ہی اُن سے کوئی بات سُنی۔ جب وہ گھر آئے تو ماں کی زبانی معلوم ہوا کہ پنڈت کرشنہ کار

---

[1] جیون چرتر ریشہ پیر، ص ۷

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اُن سے پہلے آچکے تھے اور ان کے لئے سلگتا ہوا حقہ چھوڑ گئے ہیں۔ بیٹے نے دو کش لئے ہی تھے کہ وہ کسی اور عالم میں پہنچ گئے۔ رام چندر در لکھتے ہیں :-

"دوسرا کش کھینچا تو معرفت کی چنگاری اُن کے من میں بھڑک اُٹھی اور مخمور ہو گئے۔" [1]

ایس۔ این۔ چراغی نے اس واقعے کو یوں بیان کیا ہے

"پاس ہی ایک حقہ پڑا تھا اس کے ایک دو کش لگا کو چلتے بنے پیر صاحب گھر پہنچے۔ حقہ بھر کر تمباکو پیا۔ تمباکو پینا کیا تھا آپ کا دل نورِ معرفت سے بھر گیا۔" [2]

روایت سے قطع نظر اس بات کے تواریخی شواہد بھی موجود ہیں کہ پنڈت پیر کو بچپن سے ہی عشقِ حقیقی سے مناسبت تھی اور یہ کہ اس منزل کی طرف لے جانے کے لئے انہوں نے پنڈت کرشنہ جیسے پہنچے ہوئے روحانی بزرگ کو اپنا گرو بنا لیا تھا۔ مورخ حسن رقمطراز ہیں :-

"مادر زاد ولی تھے، بچپن ہی سے جپ تپ اور گیان دھیان کے کاموں میں لگے رہتے تھے، رات کو جاگتے تھے اور ایشور کا نام جپتے تھے۔ بارہ برس کی عمر میں ملہ کھاہ سے چلتے تھے۔ کرشنہ کار کی نظر اس مزار میں اُن پر پڑی، نظر کھُل گئی۔ سب کچھ سامنے نظر آنے لگا۔ کیا یہ دنیا کیا یہ عالم بالا سب نظر میں سما گیا۔" [3]

---

[1] ماہنامہ "تعمیر" سرینگر اگست ۱۹۶۰ء ص ۹۴ ۔ [2] جیون چرتر ایشہ پیر ص ۱۱

[3] تذکرہ اولیائے کشمیر ص ۲۵۸

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پی، این کے بامزئی اپنی کتاب "اے ہسٹری آف کشمیر" میں لکھتے ہیں:-

" رلیشہ پیر کا بچپن سے ہی مذہبی رجحان تھا، انہوں نے مشہور سادھو پنڈت کرشنہ کار کو اپنا روحانی گرو پالیا تھا۔"[1]

اپنی حقیقی منزل کی نشاندھی پاکر رلیشہ نے اپنا سارا وقت زبردست تپسیا میں صرف کرنا شروع کیا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے دوبارہ چودہ چودہ سال سخت ریاضت میں گذارے۔ دوسرے دور میں کھانا پینا ترک کر دیا۔ صرف دودھ اور پانی کا استعمال کرتے تھے۔ اب وہ مکمل طور تیاگی بن چکے تھے۔ اُن کا جسم انتہائی لاغر ہو گیا اور ہاتھ پاؤں چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے۔ اُن کے خاندان والوں کا کہنا ہے کہ کڑاکے کی سردی میں ساڑھے چودہ مٹکے سرد پانی اپنے جسم پر ڈال دیا کرتے تھے اور جھلستی ہوئی گرمیوں میں ساڑھے چودہ جلتے ہوئے توت کے انگاروں سے بھری ہوئی کانگڑیوں کی آگ اپنے جسم پر ڈال کر آگ سے نہایا کرتے تھے۔[2] اس زبردست اذیت کوشی سے ان کے جسم پر بڑے بڑے گھاؤ پیدا ہوئے اور کیڑوں نے ان زخموں میں بسیرا کیا لیکن اس مجذوب کامل کو اس کی کیا پرواہ تھی۔ جن لوگوں کو من کی دنیا حاصل ہو انہیں تن کی اذیت سے کیا مطلب؟ اُن کے عقیدت مندوں اور چیلوں نے ان کے زخموں کو صاف کرنا چاہا لیکن پیر پنڈت اسی حال میں مطمئن رہے۔

رلیشہ کو اپنے فقر، قلندری اور صاحب کرامات ہونے کی وجہ سے اُسی زمانے میں اسلامی اثرات کے تحت "پیر" کہا جانے لگا۔ دلبر کاشمیری اس سلسلے

---

[1] اے ہسٹری آف کشمیر ص ۵۴۴

[2] توت کا یہ درخت اُن کے آستانے کے پچھواڑے میں آج تک کھڑا ہے اور اسے پیر خاندان کے لوگ "حمام" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

میں یوں رقمطراز ہیں:۔

"آپ نے ایسی کٹھن تپسیا کی۔ منش کیا دیوتا بھی ششدر رہ گئے۔ اس کے بعد آپ باکمال عارف تصور ہونے لگے اور کشف و کمالات میں کمال دکھایا۔ تبھی آپ پیر کے نام سے مشہور ہوئے۔"[1]

ان کے عقیدت مند چونکہ ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے لوگ تھے اور ان کے کشف و کرامات سے لوگوں کی مراد پوری ہوتی تھی اس لئے سب لوگ انہیں "پیر" کہنے لگے۔ پیر پنڈت نے ایسی کرامتیں کیں کہ ایک دنیا عش عش کر اٹھی۔ حسن کا بیان اس سلسلے میں دلچسپی سے خالی نہیں لکھتے ہیں:۔

"زبان تلوار تھی جو کہتے تھے وہی ہو جاتا تھا۔ بھکاری آن کی آن میں راجہ اور راجہ آن کی آن میں بھکاری ہو جاتا تھا۔ اگر ان کی زبان سے کچھ نکلتا تھا۔ کیا ہندو کیا مسلمان، اُن کے سخت معتقد تھے۔"[2]

اُس زمانے میں مغل شاہزادے داراشکوہ (جو اس وقت قتل ہو چکے تھے) کے اُستاد مُلّا آخون شاہ کشمیر میں اقامت پذیر تھے۔ وہ ایک اعلیٰ پایہ کے عالم تھے۔ ریشہ پیر کے ساتھ اُن کے کئی بار مناظرے ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار مُلّا آخون شاہ نے پیر پنڈت کو کھانے پر مدعو کیا۔ پنڈت پیر نے کہا کہ وہ اپنے ساڑھے بارہ سو چیلوں کے ساتھ اس شرط پر کھانے میں شریک ہوں گے کہ کھانا صاف و پاک ہو اور یہ کہ کھانے

---

[1] سالکان کشمیر و ہند المعروف سنت مالا حصۂ اوّل و دوئم ص ۵۹

[2] تذکرۂ اولیائے کشمیر ص ۵۸

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اس کے کسی حصے کو نہ چکھا ہو۔ ملاشاہ نے اس شرط کو قبول کر لیا کھانا بڑے اہتمام اور احتیاط سے پک گیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب کھانا آگیا تو پنڈت پیر نے چلو بھر پانی تھالیوں پر چھینک دیا۔ کھانے کی تمام چیزیں اپنی اصلی ہیئت میں آگئیں۔ مرغ مسلم ککڑوں کوں کرتے ہوتے ظاہر ہوئے۔ ایک مرغ ایک ٹانگ سے محروم تھا۔ باقی چیزیں سالم تھیں۔ پتہ چلا باورچی نے نمک کا مزا چکھنے کے لیے مرغ کی ایک ٹانگ کھائی تھی۔ روایت میں لپٹے ہوئے اس واقعے سے قطع نظر یہ بات تواریخی شواہد سے مصدقہ بن جاتی ہے کہ پیر صاحب اور ملا آخون شاہ[1] کے تعلقات تھے اور اُن کے آپس میں مناظرے بھی ہوئے تھے۔

---

[1] ملا آخون شاہ کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ملا آخون شاہ دراصل ایک زبردست سحر ساز تھے اور جادو کی طاقت سے پنجاب کی ایک حسینہ کو رات کے وقت اپنے پاس اڑا لاتے تھے۔ اس کی شکایت اورنگ زیب سے کی گئی۔ انہوں نے جب کشمیر کے ادب اختیار سے اس کی پوچھ گچھ کی تو انہیں بتایا گیا اتنا بڑا کمال صرف ریشہ پیر کا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ریشہ پیر کی گرفتاری کے احکامات جاری ہوئے لیکن تواریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ آخون شاہ داراشکوہ کے استاد، مشہور عالم اور روحانیت میں دخل رکھنے والے بزرگ تھے۔ حتیٰ کہ ریشہ پیر کے ساتھ اُن کے کئی مناظرے ہوئے۔ پنڈت ریشہ پیر بعض اوقات فارسی میں شعر کہتے تھے۔ چنانچہ ملا آخون کے ساتھ انہوں نے کئی بار عارفانہ گفتگو بھی اشعار میں کی ہے ایک ایسے ہی موقعے پر ملا آخون نے کہا تھا ۔ امروز شاہ شاہان مہمان شدہ است
جبریل با ملایک دربان شدہ است مارا
پیر پنڈت نے جواب میں کہا تھا
در مذہب گدایاں مرسل نبی نہ گنجد ۔ سامان بے نوایاں سامان شدہ است مارا (بہارگلشن کشمیر جلد دوئم)

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بامزی لکھتے ہیں :-

"ریشیہ پیر اپنے درویشانہ مزاج کی بدولت بہت جلد لوگوں کے ہر طبقے میں مقبول ہوئے۔ داراشکوہ کے اُستاد ملا آخون شاہ نے اُس زمانے میں ہاری پربت پہاڑی کی شمالی ڈھلوان پر اپنی خانقاہ بنائی تھی۔ اُن کے ساتھ ریشہ پیر کے کافی مناظرے ہوئے۔[1]

عمر کے آخری حصے میں مستی نے غلبہ پالیا تھا۔ وہ روحانی نور و سرور سے مخمور رہا کرتے تھے۔ عقیدت مند پالکی میں بٹھا کر ادھر اُدھر گھمایا کرتے تھے۔ اور لوگوں سے زرِ نیاز حاصل کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ریشہ پیر "پادشاہ دوجہاں" کہلائے یہ خبر جب ہندوستان کے مغل تاجدار شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے کانوں تک پہنچی انہیں بہت غصہ آیا حکم دیا کہ ریشہ پیر کو فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ حکومت کے کارندے سرکار کے حکم کی تعمیل کرنے کے لئے پیر صاحب کے پاس حاضر ہوئے۔ دوسری صبح پیر صاحب کو اُن کے ساتھ جانا تھا۔ روایت ہے کہ رات کو پیر صاحب اپنے کمال سے اورنگ زیب کے پاس پہنچے اور اُن سے پوچھا کہ طلبی کس بات کے لئے ہے؟ اورنگ زیب پیر صاحب کے کمال کو دیکھ کر متحیر ہوئے اور انہیں پیر پنڈت پادشاہ ہر دوجہاں مشکل آسان[2] کا لقب دیا۔ اور اُس وقت کے صوبہ دار کشمیر سیف خان کو حکم دیا کہ انہیں دیوسر پرگنہ میں جاگیر دی جائے[3] ریشہ پیر کی

---

[1] اے ہسٹری آف کشمیر ص ۸۸ھ

[2] تاریخ کشمیر جلد دوئم از محمد دین فوق بحوالہ "تعمیر" سرینگر اگست ۱۹۶۰ء ص ۵۲

[3] "تعمیر" سرینگر اگست ۱۹۶۰ء ص ۵۲

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

گرفتاری کے اس واقعے کا ذکر بامزئی یوں کرتے ہیں :-

"رلیشہ پیر کو اپنے معتقد پادشاہ دوجہاں کہتے تھے اور اس کے ساتھ داراشکوہ کے اُستاد کے ساتھ رلیشہ پیر کے تعلقت نے اورنگ زیب کو چونکا دیا اور خاص طور پر جب کہ اُسے ملک کے دوسرے حصوں میں مذہبی رہنماؤں کی شروع کی ہوئی بغاوتوں کا سامان کرنا پڑرہا تھا۔ اس لئے اس نے اپنے گورنر سیف خان کو حکم بھیج دیا کہ رلیشہ پیر کو گرفتار کرے۔ لیکن ہندو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ (رلیشہ پیر) اُسی رات اورنگ زیب کو خواب میں ظاہر ہوئے اور مانگ کی کہ شاہی فرمان کو منسوخ کیا جائے۔ مسلمانوں کی روایت ہے کہ چند وُزرائے شہنشاہ کو یقین دلایا کہ رلیشہ پیر کے کوئی سیاسی مقاصد نہیں بلکہ وہ محض ایک پاک طینت آدمی ہیں.....
شاہنشاہ نے احکامات منسوخ کئے اور رلیشہ پیر نے اپنے مذہبی مشن کو پُرامن طریقے سے جاری رکھا۔" [1]

بامزئی کا یہ بیان زیادہ صحت مند معلوم ہوتا ہے۔ اورنگ زیب نے تخت پر بیٹھنے کے بعد اپنے دشمنوں کو ٹھکانے لگایا۔ داراشکوہ بھی اُس کے ہاتھوں بچ نہ سکا۔ لہذا داراشکوہ کے قرابت داروں اور اس کے ہمدردوں سے اورنگ زیب کو ہمیشہ خطرہ لاحق رہا ہوگا۔ اسی طرح سرمد جیسے صوفیوں کے قتل کا آسیب بھی ہمیشہ اُس کے لاشعور میں اُسے ڈستا رہا ہوگا۔ الیسی صورت حال میں رلیشہ پیر جیسے صوفی

---

[1] اے ہسٹری آف کشمیر ص ۵۵۴

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اور داراشکوہ کے اُستاد ملّا آخون کی ملاقاتوں کو وہ کس طرح سے پسند کر سکتا تھا۔
اس کا منطقی نتیجہ رلشہ پیر کی گرفتاری کے احکامات ہی ہو سکتے ہیں۔

بامزئی کے بیان سے اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اورنگ زیب نے پنڈت پیر کے ساتھ ملاقات کی تھی۔ اس سلسلے میں ان کا یہ بیان قابلِ توجہ ہے:

"اورنگ زیب اپنے وقت کے مشہور صوفی سرمد کو پھانسی پر چڑھانے کی مذموم حرکت پہ نادم محسوس ہو رہے ہے۔ چناں چہ ۱۶۶۵ء میں جب اورنگ زیب کشمیر آیا تو رلشہ پیر نے اُسے یقین دلایا کہ سرمد جیسی عارفانہ روحیں موت کی پروا نہیں کرتیں اور نہ ہی اُن لوگوں کے خلاف گلہ کرتی ہیں، جو ان کو نقصان پہنچاتی ہیں۔"[1]

رلشہ پیر جیسا کہ ذکر ہوا پالکی میں بیٹھ کر شہر کے کئی حصوں میں گھوما کرتے تھے۔ ان دنوں وہ مجذوبِ کامل تھے وہ ساڑھے چودہ پیسے (اُس زمانے کے سکے کے مطابق) لوگوں سے نذرِ نیاز حاصل کرتے تھے۔ روایت ہے کہ ایک بار حسبِ معمول اپنے چیلوں کے کاندھوں پر سوار ہو رہی کدل کے قریب سے گھوم رہے تھے اور ان کے چیلے نذرِ نیاز لوگوں سے مانگ رہے تھے کہ کسی شخص نے شرارتاً "افیون کی گولی ان کے مُنہ میں ڈال دی، ایک شیر گوجری نے یہ حال دیکھا کہ پیر صاحب افیون کی گولی کھا گئے ہیں، دودھ کا گلاس پلا دیا۔ روایت ہے کہ محلے میں اسی شام زبردست آگ نمودار ہوئی جس میں تقریباً "دو ہزار مکان تلف ہوئے۔ ایک صرف اس شیر گوجری کا مکان بچ گیا۔ آگ کی یہ واردات کشمیر کی تاریخ میں غالباً سب سے

---

[1] ہسٹری آف کشمیر، ص ۵۹۹

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہولناک واردات ہے جس نے ایک پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا - کہا جاتا ہے
کہ جب آگ کسی طرح بجھنے نہ پائی تو لوگ پنڈت پیر کی خدمت میں حاضر ہوئے - اُن
کی منتیں کیں آخر انہوں نے اپنا ایک کھڑاؤں آگ میں ڈال دینے کی اجازت دیدی -
آگ بجھ گئی - اس روایت سے قطع نظر تواریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اسی زمانے کے آس
پاس ۱۶۷۵ میں آگ کی ایک زبردست واردات اسی علاقے میں رونما ہوئی جس میں تقریباً
دو ہزار مکان جل کر راکھ ہو گئے -

پیر پنڈت اپنی کرامات اور روحانی کمالات کے لئے سارے کشمیر میں مشہور ہیں -
کہا جاتا ہے کہ ان کی ہم عصر مشہور عارفہ الک صاحبہ روپہ بھوانی کو پیر صاحب کی یہ سب
باتیں پسند نہیں تھیں - وہ پنڈت پیر کے روحانی کمال کی قائل تھیں لیکن اس کے ساتھ
وہ جو اپنی کرامات اور خرق عادات سے اپنے آپ کو "ظاہر" کرتے تھے "روپہ بھوانی
اس سے خوش نہیں تھیں - چناں چہ انہوں نے ایک بار حقارت سے کہا تھا :-

رشمس پیرہ تنبرا مگر وُھسہ نا جن گیس
آخر دراو لایہ گروی

(ریشہ کے سینے سے آگہی کی چنگاری بھڑک اُٹھی تھی مگر ہوا کی نالی
میں سما گئی - آخر بھڑ بھونجا ہی ثابت ہوا)

کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد اُنہوں نے کرامات سے ہاتھ کھینچ لیا -

پنڈت پیر کی شادی اُن کے والدین نے ان کے بچپن میں ہی رچائی تھی - جب
وہ بالغ ہوئے انہوں نے باضابطہ طور پر گھر گرہستی کو نہیں سنبھالا اور نہ ہی ازدواجی
زندگی میں کوئی کشش محسوس کی - وہ کسی اور مٹی کے بنے ہوئے تھے - تیاگ اور تپسیا
اُن کی زندگی کا آدرش تھا - وہ اُس بے پایاں سمندر میں جذب ہو جانا چاہتے تھے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

جہاں زندگی اور موت ، دُکھ اور سُکھ ، اپنے اور بیگانے کا کوئی امتیاز نہیں جہاں دنیا کی لذّت کوشی محض ایک فریب ہے ۔ ان کی بوڑھی ماں کو یہ اسرار کیا معلوم ؟ اُن کا اصرار تھا کہ پنڈت گوبند جو خوش کے خاندان کا نام زندہ ہے ۔ پیر صاحب نے ماں کا دل رکھا ۔ اُن کا ایک بیٹا ہوا ۔ رہانند جس نے بعد میں اپنے والد کی طرح سنیاس کا مارگ اختیار کرلیا ۔ رہانند کے دو بیٹے ہوئے ۔ اُن کا خاندان آج تک باقی ہے یہ لوگ پنڈت پیر کی چھٹی پشت سے ہیں ۔ ان لوگوں کے رسم ورواج عجیب وغریب ہیں ۔ ان کے گھروں میں نہ شنکھ بجتا ہے نہ ٹھاکر دوارہ ہوتا ہے ۔ اُن کا خیال ہے پیر پنڈت کے فیض سے کبھی شتلا ماتا ان کے گھروں میں آنے کی جرأت نہیں کرتیں اور آج تک ان کے خاندان میں کبھی کسی کو چیچک نہیں نکلی ہے ۔ پنڈت پیر کا استھاپن اسی جگہ ہے جہاں وہ کسی زمانے میں اقامت پذیر تھے ۔ ان کا کھڑاوں اب تک موجود ہے ۔ پیر خاندان کے افراد کا کہنا ہے کہ اس استھاپن میں کسی زمانہ میں ایک خزانہ پایا جاتا تھا ، جس سے حسب ضرورت خاندان والوں کی مراد پوری ہوتی تھی ۔ لیکن اُن کے اپنے حرص ، کم مائیگی اور خود غرضی نے اُن سے یہ خزانہ چھین لیا ۔

پنڈت ریشہ پیر اپنے تقدّس اور عارفانہ کمالات کی وجہ سے ہندو اور مسلمانوں میں یکساں عزّت اور اعتقاد کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے ۔ ۱۶۹۷ء میں لبالکھ کرشن بکشی کی سرشتی کو ساٹھ سال کی عمر میں اُسی دن سورگباش ہوئے جس دن وہ پیدا ہوئے تھے ۔ روایت ہے کہ ان کے سورگباش ہونے کے بعد ان کا جسد خاکی غائب ہوگیا تھا ۔ مؤرخ حسن لکھتے ہیں :-

" ایک پہر رات گذرنے پر ان کا انتقال ہوا ۔ ان کی لاش کو

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دریا پر لے جا کر دھویا اور کفن پہنایا گیا۔ مسلمانوں کو خبر ہوئی
ہجوم کر کے دوڑے۔ دیکھا کہ تختہ پر کفن ہی ہے اور کچھ نہیں۔
ہندوؤں نے تختہ اور کفن جلا دیا۔" [1]

اور اس طرح سے ایک مجذوب کامل، ایک پاک روح، اپنے کشف اور روحانی کمالات کی زندہ تاریخ چھوڑ کر روایت کا ایک حصہ بن گئی

●●

---

[1] تاریخ اولیائے کشمیر، ص ۴۵۸ - ۴۵۹

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کشمیری لوک گیتوں کا سماجی پس منظر

یہ بتانا آسان نہیں کہ لوک گیت کب پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ صدہا سال پہلے انسان نے جب ایک سماجی زندگی میں رہنے بسنے کا سلیقہ سیکھا۔ غالباً" لوک گیتوں نے اسی زمانے میں جنم لیا ہوگا۔ زمانۂ قدیم کے انسان نے جب خوابوں کو اپنی آنکھوں میں تھرکتے ہوئے دیکھا ہوگا یا اپنے آپ کو غموں اور دکھوں سے نڈھال پایا ہوگا یا اپنی مشقّت کے بوجھ خوشیوں کے وفور، گزری ہوئی زندگی کی تلخ کامیوں، نا آسودہ جذبوں کے اظہار یا مستقبل کی تمناؤں کا احساس کیا ہوگا تو گواں گاں کرتے ہوئے گنگناتے ہوئے لوک گیتوں کی کسی فارم نے تشکیل پائی ہوگی۔

لوک گیتوں کی کوئی سلسلہ وار تاریخ نہیں ہے۔۔۔ لوک گیتوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو ہر جگہ وہی درد و کسک کی دھیمی دھیمی آنچ وہی تمناؤں کے خواب' آنکھوں کے پپوٹوں کو تر کرنے والے وہی آنسو نظر آتے ہیں جو ہماری لوک شاعری میں ملتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی جذبات اور محسوسات آفاقی ہیں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ور دنیا کا کوئی قانون، کوئی دستور، کوئی احتساب ان کے ٹکڑے نہیں کر سکتا۔ لوک گیت غیر تحریر شدہ انسانی دستاویز ہیں جو سینوں کی تختیوں پر لکھے گئے ہیں۔ اور نسل در نسل منتقل ہوتے آئے ہیں۔ یہ داستانیں ہیں۔ ان لاکھوں کروڑوں انسانوں کی، جواب اس دنیا میں نہیں۔ لیکن ان کے تجربات اور محسوسات ہماری قیمتی میراث ہیں۔ ان میں ایسی ہی مہانتا، ایسی ہی مدھرتا، ایسی ہی وارفتگی اور ایسی صدا ہوتی ہے جو آہستہ آہستہ دل کے نہاں خانوں میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ یہ گیت زماں و مکاں کی قید سے لاتعلق انسانی جذبات کے ضامن ہیں۔ چین کے مشہور قلم کار لو ہسن نے ایک دفعہ بالکل صحیح کہا تھا:۔

"لوک گیت ان ہیروں کی طرح ہیں جو صدیوں سے دھرتی کے سینے میں دفن ہیں اور اس دن کے منتظر ہیں جب کوئی اہلِ نظر ان کو ہیروں کی مانند زمین سے ڈھونڈ نکالنے کے لئے پیر کھے گا۔"

تمام دوسری زبانوں کی طرح کشمیر کے لوک گیتوں کی روایات زمانۂ قدیم سے چلی آ رہی ہیں۔ ان میں شعر و شاعری کے بندھے ٹکے اصول نہ سہی لیکن ان کی اپنی ادبی اور لسانی اہمیت ہے۔ یہ شاعری بڑی تاریخی اور سماجی اہمیت کی حامل ہے۔

کشمیر کی لوک شاعری یہاں کی سماجی زندگی کا آئینہ ہے۔ اس میں ہم اپنے صدیوں پرانے چہرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے گزرے ہوئے لمحات، ہمارا کلچر، ہماری دانش مندی، ہماری سماجی بندشیں، ہمارے مصائب اس آئینے میں صاف طور پر جھلکتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہمارا ملک ایک زمانے تک جاگیردارانہ نظام میں مُقیّد رہا ہے اور اس نظام نے ہماری تقدیر کی لکیروں کو مٹا کے رکھ دیا تھا۔ ہمارے حصے میں محنت، بے گار، افلاس، ناداری اور بے بسی آئی تھی۔ سماجی نابرابری نے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بے شمار سماجی بدعتوں کو جنم دیا اور ہماری گھریلو زندگی میں جہیز ساس بہو کے جھگڑے، گھر داماد کے مصائب اور ایسے ہی دوسرے مسائل داخل ہوتے۔ پس ماندگی کا یہ عالم تھا کہ آئے دن قحط سالی، سیلاب کی تباہ کاریاں، آتش زدگی کی وارداتیں، جاڑے کی شدت اور دوسری مصیبتیں ہمارا مقدر بن گئی تھیں۔ ہماری لوک شاعری نے وقت وقت پر بدلتے ہوئے سماجی حالات کی عکاسی کی ہے۔ سماجی زندگی میں انسانی قدروں، رواداری، خلوص، انسان دوستی اور ایسے ہی ارفع جذبات کی جو اہمیت ہے، اس کی تصویر کشی جس طرح ہماری لوک شاعری میں ملتی ہے، اس کا جواب نہیں، ہمارے لوک گیت محض الفاظ کا خوبصورت مرقع ہی نہیں بلکہ ان میں تجربات اور محسوسات کا عرق ملتا ہے۔ ان میں تخیل کی زرکاری کا احساس ہی نہیں ہوتا بلکہ اس بستی کی بو باس بھی ملتی ہے۔ ارضیت کے سارے کھرے اور کھوٹے پہلو سامنے آجاتے ہیں اور یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ ان لوگوں کی داستانِ حیات ہے جو ہم سے پہلے اس بستی میں رہتے آتے تھے اور جنہوں نے ہم کو جنم دیا۔ ہماری لوک شاعری کی یہی خصوصیت اس کو عظیم اور ارفع بناتی ہے۔

رمضان کی متبرک شامیں ہوں یا شادی بیاہ کے ہنگامے، کھیتوں میں محنت کا پسینہ بہانے کا سماں ہو یا جہلم کے سینے پر بھاری بھرکم کشتیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کا کٹھن سفر، لوک گیتوں کا کوئی نہ کوئی بول فضاؤں میں رس گھولنے لگتا ہے۔ یہ سلسلہ سال ہا سال سے چلتا آیا ہے۔ محنت سے پھوٹتا ہوا پسینہ، دل کے زخموں کے ناسور، غم اور کرب کے آنسو —— خود بخود ان نغموں کے مرہم سے شو کچھ جاتے ہیں ——

ہمارے لوک گیتوں کی مقبول ترین صنف "لڈی شاہ" کے نام سے موسوم ہے لڈی شاہ ایک طرح کا "BALLAD" ہے۔ اس صنف میں ہماری تاریخ کے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کتنے ہی حقائق مضمر ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس صنف میں باقی اصناف کے مانند فنی چابکدستی نظر نہیں آتی لیکن جس بے باکی سے اس صنف میں ہماری سماجی زندگی کی عکاسی ملتی ہے کسی اور صنف میں یہ یارا نہیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس صنف کی مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ لڈی شاہ میں کسی عوامی دلچسپی کے واقعے، کسی معقول انسانی تجربے، کسی آفت سماوی یا ہماری سماجی زندگی میں رونما ہوئے کسی اہم تجربے کو بیان کیا جاتا ہے۔ اس کا انداز مزاحیہ ہوتا ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ لوگوں کی تفریح طبع کا سامان ہوتا ہے بلکہ طنز کے زہر میں بجھے ہوئے تیر بھی ہوتے ہیں۔ لڈی شاہ سماجی زندگی میں رونما ہوئے غیر صحت مند واقعات کی دھجیاں اڑاتا ہے اور عوامی زندگی کے مسائل کی ترجمانی بہتر طریقے سے کرتا ہے۔

جاڑے کی ستم رانی کا ذکر ہو یا سیلاب کی تباہ کاریاں، کسانوں سے اناج چھیننے والے جاگیر شاہی کے سرکاری کارندوں کے مظالم ہوں یا آتشزدگی سے پریشان حال لوگوں کے مصائب، گھر داماد کی بے بسی کا ذکر ہو یا عورتوں کے مکر و فریب کے حربے، لڈی شاہ کی طنزیہ صنف ان سارے سماجی مسائل کا احاطہ کرتی ہے اور پوری صداقت اور بیباکی سے ان کا اظہار کرتی ہے۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

یہ پروردگار کی رضا تھی

کہ "سیلاب سنگھ" زورآور ہوا

جمعے کو آسمان پر کالی گھٹا چھائی

سارے کشمیر میں خوف کی تھرتھری طاری ہوئی

لوگ ہیبت زدہ ہو گئے اور جانیں تلف ہو گئیں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سیلاب سنگھ زور آور ثابت ہوا

"ہی جن" کا میدان پانی میں ڈوب گیا

اب صرف اس کا ایک سنہوار آتا ہے یہ

سیلاب سنگھ زور آور ثابت ہوا

گراٹ والے مغرور ہو چلے تھے

وہ لوگوں کو ذبح کرتے تھے

اور خون ناحق پیا کرتے تھے

سیلاب سنگھ زور آور ثابت ہوا (سیلاب)

ہماری زندگی ہمارے دیہات ہیں اور دیہات کی زندگی فصلوں کی کامیابی پر منحصر ہے ۔ دھان کی فصل کے لیے پانی کی بہتات ایک لازمی امر ہے ۔ پانی کے سوتے سوکھ گئے تو دیہات کی زندگی کے سوتے سوکھ جاتے ہیں ۔ بعض اوقات جب پہاڑوں پر برف کم ہوتی ہے یا بارشیں نہیں ہوتیں تو ندیاں اور نالے سوکھ جاتے ہیں ۔ اس سے چاروں طرف کہرام مچ جاتا ہے اور بعض اوقات خون خرابہ بھی ہوتا ہے ۔ یہ مسئلہ سال ہا سال پرانا ہے ۔ ہماری لوک شاعری نے اس کا احاطہ کیسے کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو :-

پانی قلت نے کیا ستم ڈھائے

"آرہ والے" لوگوں نے ہنگامہ برپا کیا

گورنر کے پاس فریاد لے کے چلے

کھلے دل سے حال دل بیان کیا

پانی کی قلت نے کیا ستم ڈھائے !

پینے کے لئے پانی کی بوند نہیں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

میدان میں شگاف پڑ گئے ہیں

دھان کے کھیت آنسو بہا رہے ہیں

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جب پاکستانی حملہ آوروں نے ہماری ریاست پر دھاوا بول دیا رسل و رسائل کے سارے راستے منقطع ہو گئے۔ وادیٔ کشمیر میں خوراک اور دوسری چیزوں کی کم یابی کے ساتھ جس چیز کی کمی محسوس کی گئی وہ نمک تھا۔ نمک کی قلّت کی وجہ سے بڑے دلچسپ واقعات رونما ہوئے۔ لڈی شاہ میں اس کا ذکر دیکھئے :۔

نمک کی کم یابی سے کیسے خوش جمال چہرے بے نمک ہو گئے

نمک مہنگا ہو کر غائب ہو گیا

نمک کے بغیر کسی نعمت میں ذائقہ نہیں

نمک کی کم یابی سے ....

لوگوں نے نمک کی چوریاں شروع کر دیں

زونؔ نے اپنے آنچل میں نمک کے ڈلے چھپا لئے

رحتیؔ نے قسمیں کھائیں

نمک کی کم یابی سے ....

اے لوگو ! توبہ کرو

ہمارے گناہ ہماری مشکلات کے ذمہ دار ہیں

بے نمک کتنے خوان بے لذت ہیں (نمک کا قحط)

(یا)

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ذرا رک جاؤ اور میری بات سُنو
میں تمہیں نمک کے قحط کی بات سناؤں

شوہر بیوی سے بدگمان ہے
اور گھریلو سامان مُقفّل کر دیا ہے
خود ہی بیوی کو چیزیں لا دیتا ہے
(کیونکہ) اُسے ڈر ہے کہ بیوی اسراف نہ کرے!

ذرا رک جاؤ اور میری بات سُنو
میں تمہیں نمک کے قحط کی بات سُناؤں (نمک کا قحط)

انگریزوں کے کالے قانون کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اسے یوں ہدفِ ملامت بنایا ہے:-

انگریزوں کا قانون بھی کیا قانون تھا!
رحیم بٹ نے جوں ہی غسل خانے کا دروازہ کھولا
فارسٹر کی آواز گونجی
ارے بے وقوف، غسل سے احتراز کر!
اگر تو نے طہارت کی تو تجھے
جلاوطن کیا جائے گا!

لڈی شاہ کے مزاج کے بالکل متضاد ایک اور صنف ہے جو رُوْد یا رؤف کرائی جاتی ہے۔ رُوف خالص طور پر عورتوں کی چیز ہے۔ رمضان کی متبرک شاموں کو ہمارے آنگن روف کے سُریلے آہنگ سے گونج اُٹھتے ہیں۔ کنواریاں نئی نویلی دلہنیں اور کم عمر عورتیں اپنے گلے کے سوز سے ایک جادو جگاتی ہیں۔ روف کا آہنگ ہی اپنے رس سے دلوں میں عجیب گداختگی پیدا کرتا ہے۔ یہ شادی بیاہ کی تقاریب پر بھی بڑے اہتمام سے گایا جاتا ہے۔ نازک اندام جوانیاں دُو ٹولیوں میں بٹ جاتی ہیں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

آمنے اور سامنے اور ایک ہی جگہ پر اپنے سُبک خرام قدموں کو آگے اور پیچھے دھرتی ہوئی گیت کی لَے کے ساتھ تال ملاتی ہوئی رَوف کے مصرع دہراتی ہوئی " اپنے دِل کا سارا سوز اور ساز ملاتی ہیں - چوڑیوں کی کھنک اور اپنے کپڑوں کی سرسراہٹ کے ساتھ جب لَے بلند ہوتی ہے تو ایک سماں بندھ جاتا ہے - رَوف قدموں اور آوازوں کا رقص ہے - رَوف کے بولوں میں ایک عجیب والہانہ پن ہوتا ہے اور من میں ایک بے نام سی تھرتھراہٹ اُبھرنے لگتی ہے - رَوف کے گیتوں میں کنوارپنے کے ارمان اور نئی نویلی سہاگنوں کی سسکیاں ملتی ہیں - میلے میں گذری ہوئی زندگی کے لمحات کا لمس، بادل کے ریگ زار، جہیز کی مانگوں کے کانٹے، ساس سسر اور نند کے طعنے، ممتا کی ٹیسیں، کلیجہ مُنہ کو لانے والے ہجر کے، سماجی بندشوں اور بدعتوں کا کٹیلا بیان، ساجن کے ہجر میں دِل کے تاروں کو چھیڑنے والی صدائیں کیا کچھ نہیں ہوتا - ان کا بغور مطالعہ ہماری سماجی زندگی کی آئینہ داری کرتا ہے - چند مثالیں پیش ہیں :-

سکھی ری جا !
ساجن کو آہستہ سے آواز دے !
وہ مجھ سے روٹھ کر چلا گیا ہے
اُسے کیا رنج و ملال ہے ؟
سکھی ری جا !
میں اپنے آنگن میں چشمے کے کنارے
اس کی راہ تکتی رہوں گی
ایسا نہ ہو کہ دشمن مجھ بے بس کا مذاق اُڑائیں
دیکھ شیرین کے لئے فرہاد پر کیا بیت رہی ہے ؟

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دیکھ لیلیٰ کے لئے مجنوں کیسے بدحال ہے؟
ہبی مال کے لئے ناگرائے کیسے پریشان ہے؟
سکھی ری جا!
ساجن کی جدائی میں شرم و حیا کے سارے بندھن توڑ کے سہمی سہمی آواز
ملاحظہ ہو:-

ہجر کی آگ میں خاکستر ہوں
چلے آؤ!
میں آرام میں پڑی ہوئی زلیخا
خواب سے بیدار ہو گئی ہوں
اے یمن کے سوداگر
میں چمن میں تیرے لئے
سنگھاسن بچھا دوں
اپنوں سے پامال ہوں
اے میرے پیا!

برہ کی اگنی میں جلی ہوئی کشمیری دوشیزہ جب اپنے محبوب کو یاد کرنے لگتی ہے تو در و دیوار شق ہو جاتے ہیں۔ اُس کا پیار اسی اگنی کی طرح پاک اور پوتر ہے۔ محبوب کے جلوے کی تلاش جنوں کی حد تک پہنچ کر آواز کے قالب میں یوں ڈھلتی ہے:

چاروں اور تمہارا جلوہ دیکھا
اب کہاں ڈھونڈوں؟
رات دن تیری تلاش میں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پاؤں چھلنی ہو گئے

یہاں آئی تو تمہارا پیڑ تو دیکھا

اللہ کا شکر کہ ٹھکانہ بتا دیا

لیکن ــــ لیکن کہاں چلے گئے

جب تو میری راہ سے گذرے گا

تو میں صدیوں کی بیمار

صحت یاب ہو جاؤں !

میرے روم روم میں زندگی کی لہر دوڑ جائے

تب ہونٹوں پر مسی لگا کر

آنکھوں میں کاجل بھر کے

سولہ سنگار کر کے

تمہارے دامن کو تھام لوں

ہماری سماجی زندگی میں ساس بہو، بہو نند، بہو سسرال کے رشتوں کی بڑی اہمیت ہے آج اگرچہ زمانہ کافی آگے بڑھ چلا ہے لیکن ان رشتوں میں بندھنوں کے ساتھ ساتھ تلخیاں اب بھی ملتی ہیں۔ ہماری بہو ایک آئیڈیل بہو ہے جس کی قسمت میں صدیوں سے مصائب چلے آئے ہیں۔ سسرال کی سخت گیریاں، بہو کا ضبط اور لڑکی والوں کا صبر ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ ہماری لڑکیوں کا اصلی گھر ازل تا ابد ان کا سسرال ہے۔ یہیں اُس کا جینا، یہیں اُس کا مرنا، ہماری لڑکی للی ایشوری ہے جس نے نیلہ وٹھ (بھاری پتھر) ہمیشہ سینے سے لگائے رکھا۔ ایک غم زدہ بہو اپنے آنسوؤں سے رؤف کو اس طرح سینچتی ہے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

میں گھاٹ کی طرف چل دی

وہاں مجھے بابا ملا

وہ مجھے گھر لے گیا

سیڑھیوں پہ پھولوں کا بستر بچھا دیا

مجھے اپنے کمرے میں لے گیا

رنگ دار کمرے میں سیج پر بٹھا دیا

میری دائیں جانب طوطا رکھا

بائیں طرف جلتی ہوئی شمع

سامنے قرآن مجید

میں نے دھیمے دھیمے رازِ دل اظہار کرنا شروع کیا

میری آنکھیں چھلک گئیں

بابا نے کہا

بیٹا! یہ سب سہنا ہوگا

گھاٹ سے پانی کا مٹکا لے جا!

ساس سسر کے پاؤں دھو لے

بیٹا رانی! جا اپنے گھر جا!

میکے میں رہنا اچھا نہیں لگتا

سسرال کی سختیاں جھیلنا سیکھ

یہ ہے ہمارا اصلی کلچر۔ ضبطِ نفس اور ایثارِ نفس کی تربیت جو ہم اپنی بیٹیوں کو دیتے ہیں، یہ ساری چیزیں ہماری لوک شاعری میں سال بہ سال سے محفوظ ہیں۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہماری سماجی زندگی میں شادی بیاہ کی اپنی اہمیت ہے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پہ ہمارے گھروں میں بے شمار رسومات انجام دی جاتی ہیں۔ یہ رسومات ہندو گھرانوں میں بھی ہوتی ہیں اور مسلمان گھرانوں میں بھی۔ "ونہ وُن" لوک شاعری کی وہ صنف ہے جو ایسے ہی موقعوں پر استعمال کی جاتی ہے۔ دلہن کے بال گوندھنا، غسل کرنا، پوشاک بدلنا، بال بنانا، مہندی لگانا، بیاہ کا لباس زیبِ تن کرنا، سسرال جانا، برات کا استقبال، نکاح خوانی یا لگن منڈپ پر کنیادان، دُلہن کی رخصتی، یگنوپویت کے گیت غرض کون سی رسم ہے جس کا ذکر ان گیتوں میں نہ ہو۔ حق تو یہ ہے کہ اگر یہ گیت نہ ہوں تو شادی بیاہ محض ایک خشک اور سپاٹ لین دین بن جائے! یہ گیت ایسی تقاریب میں رنگ بھرتے ہیں۔ "ونہ وُن" کے گیت بلیغ ہوا کرتے ہیں۔ ہر گیت اپنی تقریب کے لئے مخصوص ہیں اور تقریب کا ایک وضاحتی بیان ہے۔ ان گیتوں میں عورتیں اپنے خاندان اور اہلِ خاندان کی عظمت کے گیت گاتی ہیں۔ تمام متعلقین کے لئے دُعائے خیر کرتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ سماج کے ڈھائے ہوئے مظالم اور زمانے کی بے راہ روی پر طنز بھی کرتی ہیں۔ لیکن ان گیتوں کا سب سے جاندار حصہ وہ ہے جس میں بابل کے گیت چھیڑے جاتے ہیں۔ لڑکی کو وداع کرنے کے گیت۔ ان بولوں میں ایسی غم انگیزی ہوتی ہے کہ رقّت طاری ہو جاتی ہے اور سننے والا دل مسوس کر رہ جاتا ہے۔ ان گیتوں کی افادیت اس لئے بھی زیادہ ہے کیونکہ ان میں ہمارا سارا معاشرہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ریت، رواج کھُل کر سامنے آجاتے ہیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہاں یہ گیت مختلف اسٹائل کے ہیں لیکن جہاں تک موضوع کا تعلق ہے وہ یکساں ہے۔ اس میں وہی آفاقی حقیقت پنہاں نظر آتی ہے۔ انسانی درد و کسک۔ وقت کی تیز رفتاری نے ان گیتوں میں کہیں کہیں تبدیلی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پیدا کر دی ہے اور آج کے گیتوں میں نئی چیزوں کا اضافہ ہوا ہے جو ہم آئے دن کی زندگی میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس طرح سے بعض پرانی چیزیں حذف ہو چکی ہیں۔

اس صنف کی چند مثالیں پیش ہیں۔

رخصتی

پشمینے کا دوشالہ ہے اور ریشم کا لباس
جا بیٹا تیرا سہاگ قائم رہے
اے نور، تو ڈولی میں چھپی بیٹھی ہے
اے مستور، اب تو خموش کیوں ہے؟
جا تو حضرت بل کی سمت آباد رہ
اور ڈل میں کشتیوں کی سیر کر!

(یا)

اندھیرے میں موتیوں کی مالا تیرے ہاتھ آگئی ہے
تو نے ہماری مینا کو باتوں میں پھسلایا ہے
مجنوں چاروں اور کھوج رہا ہے
کس دریچے سے شاہ پری جلوہ گر ہو!
پال پوس کر اسے تیرے حوالے کر رہے ہیں
خدا کا واسطہ ہے اس کی دیکھ بھال کرنا
ہم پہلے ہی کہہ چکے
ہماری بیٹی معصوم ہے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

۱ اس کا بیاہ تم سے کبھی نہ ہوتا !

ہم تمہاری باتوں میں آکر بہک گئے

(یا)

اب تک تو ہمارے گھر کی رکھوالن تھی

جا ماں کی لاڈلی، اب سسرال کی راہ لے !

پہلے پھر لوٹنے کا وعدہ کر !

پھر اپنے ساجن کے ساتھ جا

کشمیری پنڈتوں کے " ونہ وُن " میں ان کی دیومالائی تلمیحات کا بھرپور استعمال نظر آتا ہے ۔ جذبات وہی ہیں جو دوسرے لوک گیتوں میں نظر آتے ہیں ۔ مثلاً

ہاتھی بوجھ سنبھالے بڑھتے ہیں اور دولہا گھوڑے پر سوار

ہماری مینا کا دولہا سجیلے پرندے میں آیا ہے

سُبھدرا کا واسدیو باسلامت رہے

زر بفت کا لباس وہ لندن سے لایا ہے

سمندر پر صندل کی لکڑی سے بند لگوایا

دُولہا رام چندر کی راہ سے آیا ہے

اے سوریہ بھگوان ! تو پورب سے طلوع ہوا

اب پچھم کی طرف کرنیں بکھیر

وِشوامتر بابا اور مینا کے میاں کے لئے

دُور قندھار کا راجہ آیا ہے !

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دوسری طرح کے لوک گیتوں میں "وڑن" (گیت)، "نیری باتھ" (چرواہوں کے گیت) "نینہ باتھ" (کھیتوں میں ملائی کے گیت) وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "وڑن" کے گیتوں میں پیار و محبت کا وہی ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آتا ہے۔ یہ گیت بھی شادی بیاہ کی تقاریب پر گائے جاتے ہیں۔ "نیری باتھ" اور "نینہ باتھ" ہمارے محنت کش طبقہ کے گیت ہیں۔ مسلسل محنت کی تھکان سے جب ہمارے چرواہے اور کسان شل ہو جاتے ہیں تو ان کے لبوں سے نغمے پھوٹتے ہیں۔ یہ نغمے ان کے تھکن سے چور، ٹوٹے ہوئے جسم میں زندگی کی حرارت پیدا کرتے ہیں اور وہ ایک نیا عزم لے کر کام میں جٹ جاتے ہیں۔

ہمارے لوک گیتوں میں نہ صرف ہماری دیو مالا کا عکس نظر آتا ہے۔ بلکہ ان کو پڑھ کر ہماری خوراک، ہمارا لباس ہمارا سامان آرائش، ہمارے اعتقادات ہمارا دین اور دھرم، ہمارے موسموں کے رنگ اور ان کے اثرات، ہمارے رنج اور غم، خوشی اور مسرت، ہمارے توہمات ہمارا خلوص ہماری رواداری، ہمارے رشتے ناطے ہمارے پرندے اور حیوان اور ہماری زندگی کے ساتھ تعلق رکھنے والی ہر شے ہمارے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ ہماری زندگی کے کتنے ہی باب کھل جاتے ہیں۔ جن کا مطالعہ دلچسپ بھی ہے نظر فریب بھی اور لازمی بھی۔

●●

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اردو افسانہ — ریاست میں

بیسویں صدی کے آغاز میں پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم نے اردو افسانے کا پہلا چراغ روشن کیا۔ اسی صدی کے دوسرے اور تیسرے دہے میں یہ اردو کے نثری ادب کا سب سے مقبول شعبہ بننے لگا۔ ملکی سیاست کے شعور اور مغربی ادب کے مطالعے نے اس صنف میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کی اور اردو کا مختصر افسانہ معاصر زندگی کے سیاسی، سماجی اور نفسیاتی پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے ترقی کے زینوں کو پھلانگنے لگا۔ اس کا اولین روپ "انگارے" کے افسانوں میں بھرپور توانائیوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا لیکن اس کے بیشتر افسانے ۱۹۳۰ء میں ہی مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے تھے۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان کی شروعات گذشتہ صدی کے اواخر میں ہوئیں اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ۱۸۸۹ء میں اسے سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کیا۔ سرکاری سرپرستی حاصل ہوتے ہی یہ زبان ریاست کی سماجی اور سیاسی زندگی میں شاندار

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

رول ادا کرنے لگی ۔ آہستہ آہستہ تعلیمی اداروں، عدالتوں اور سرکاری محکموں میں اسے
برتا جانے لگا ۔ اور پھر اہل علم نے اسے شعر و ادب میں اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا وسیلہ
بنایا ۔ اس صورت حال کے پیش نظر بعض کشمیریوں نے لاہور سے اخبارات جاری کئے
جن میں مراسلہ کشمیر، خیر خواہ کشمیر، بہار کشمیر، صبح کشمیر، اخبار عام، پنجہ فولاد وغیرہ خصوصیت
کے ساتھ اہم ہیں ۔ ان میں سے بیشتر اخبارات میں جموں و کشمیر میں رہنے والے لوگوں نے
وقتاً فوقتاً لکھنا شروع کیا ۔ ہر گوپال کول خستہ کا "خیر خواہ کشمیر" گوپی ناتھ گوردلو کا "اخبار
عام"، محمد دین فوق کا "پنجۂ فولاد" اور "کشمیر میگزین" اور اوتار لال لقایا اور لچھمی
نرائن کول کا "بہار کشمیر" خاص طور پہ قابل ذکر ہیں ۔ یہ بیسویں صدی کے پہلے اور
دوسرے دہے کا زمانہ ہے ۔ جب اردو افسانہ مجموعی طور پہ ابھی گھٹنوں کے بل چلنے کی کوشش
کر رہا تھا ۔ اس لئے ریاست جموں و کشمیر (وادی کشمیر میں خاص طور پہ) کے اہل علم ایک دور
افتادہ مقام پر ہونے کے باعث صنف افسانہ کی طرف فوری طور پہ متوجہ نہیں ہوئے بلکہ بیسویں
صدی کے دوسرے دہے کے اواخر میں اس نئی صنف میں سر پیر مارنا شروع کیا ۔

ریاست میں اردو افسانے کی طرف سب سے پہلے مورخ، ادیب، شاعر اور صحافی منشی محمد دین
فوق نے توجہ دلائی ۔ اگرچہ فوق نے زندگی کا بیشتر حصہ پنجاب میں گذارا لیکن ان کے کشمیریت
کے جذبے کے بارے میں دو رائیں قطعی نہیں ہو سکتیں ۔ فوق نے روش زمانہ کے مطابق
کئی تاریخی اور نیم تاریخی قصے قلمبند کیے جنہیں ہم ریاست میں اردو افسانے کے اولین نقوش
کہہ سکتے ہیں ۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اس میدان میں کس سے متاثر ہوئے لیکن بہر حال
ان کے طبع زاد قصوں میں کہانی کا بنیادی کینڈا ضرور ملتا ہے ۔ فوق کے بعد چراغ حسن حسرت
کا نام لیا جا سکتا ہے ۔ ان کی ادبی حیثیت ہمہ جہت ہے ۔ انہوں نے کس صنف
میں اپنا قلم نہیں آزمایا ۔ تاریخ، سیاحت، صحافت، شاعری، افسانے، ...کے افسانوں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کا مجموعہ "کیلے کا چھلکا" ۱۹۲۷ء میں لاہور سے شائع ہوا۔
مدِّنظر رہے کہ ابھی ریاستی سطح پر صحافت کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں ریاست کا پہلا اخبار "رنبیر" جموں سے لالہ ملک راج صراف کی ادارت میں شائع ہونے لگا اس نے ریاست کے قلم کاروں کی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقعہ فراہم کیا۔ "اخبار عام" اور "رنبیر" کے حلقے میں دوسرے لوگوں کے ساتھ پریم ناتھ سادھو رونق بھی شامل ہوئے اور اپنی ادبی زندگی کی شروعات شعر و شاعری سے کی۔ لیکن ۱۹۳۲ء کے بعد وہ نثر کی طرف متوجہ ہوئے۔ رونق کو ادب اور خاص طور پر کہانی کی صنف کی طرف متوجہ کرنے کی تحریک ان نجی محفلوں میں ملی جو ان کے ادب نواز دادا پنڈت مکند کول کے گھر میں منعقد ہوا کرتی تھیں، جہاں شعر پڑھے جاتے تھے اور اقبال اور چکبست کے ساتھ ساتھ پریم چند اور ٹیگور کی کہانیاں بھی پڑھی جاتی تھیں اور ان پر اظہار خیال ہوتا تھا رونق جو بعد کے برسوں میں پردیسی کے نام سے مشہور ہوئے، ان محفلوں سے تحریک پاکر شعر و ادب کی دنیا میں آگئے۔ شعر کہنا شروع کئے لیکن یہ میدان راس نہ آیا۔ دراصل وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے شعری وسیلے سے اس کا بھرپور اظہار نہیں ہو پاتا تھا۔ اس دوران پریم چند کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ سجاد حیدر یلدرم، اعظم کریوی، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری کے افسانوں کی دھوم مچی تھی۔ پریم چند مثالیت پسندی سے حقیقت پسندی کی طرف آگئے تھے۔ اور نئے فنی تصورات اور امکانات کے ساتھ معاشرتی اور سیاسی زندگی کو پیش کرنے لگ گئے تھے۔ یلدرم، نیاز، مجنوں اور سلطان حیدر جوش رومانی دبستان کی بنیاد ڈال چکے تھے اور تخیلی افسانے لکھ رہے تھے ٹیگور کے ادب لطیف کے ترجموں نے زبان و بیان کا جادو جگایا تھا۔ اسی فضا میں پردیسی کا ذہن پروان چڑھا اور وہ ادب لطیف اور نثری شاعری کے ادب

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پارے تخلیق کرنے لگے۔ لیکن پھر پریم چند کے "کفن" اور "انگارے" کی اشاعت نے
ان کے ذہن کو مکمل طور سے بدل دیا۔ اس زمانے میں ڈوگرہ شاہی کے جبر و استبداد
کے خلاف ہماری تحریک آزادی کا آغاز ہوا تھا جو شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں ایک نئے
مرحلے میں داخل ہوئی تھی۔ پردیسی جیسا حساس فنکار ان تمام باتوں سے دامن نہ بچا
سکا۔ چنانچہ ابتدائی دور کے ادب لطیف اور راجو کی ڈولی' پارسل' ماں کا پیار' جے
کارا' سنتوش' حسین پیامبر' سندھیا کا شراپ اور "شام و سحر" (اولین مجموعہ) کی
کئی کہانیوں کی طرح' جن میں زندگی کی مہک سے خالی رومان اور جذبات سے بھرے
ہوئے خواب ہیں' آہستہ آہستہ کم ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی بجائے وہ سیدھے
سادے انداز کو اپناتے ہیں۔ وہ اپنے فن کو جس میں موضوع سے قطع نظر انسانی نفسیات
کی باریکیاں ضرور نظر آتی ہیں اب زندگی کے خارزار میں پہنچا دیتے ہیں اور آخری سانس
تک صحیح معنوں میں کشمیر اور کشمیریت کو اپنے اصلی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔

پردیسی کے افسانوں کے دوسرے مجموعے "دنیا ہماری" کا اسلوب "شام و سحر"
کے افسانوں سے مختلف ہے اور بقول راجندر سنگھ بیدی یہ افسانے اپنی
سادگی اور معصومیت کی بنا پر ٹالسٹائی کی یاد دلاتے ہیں۔ پردیسی کے تخلیقی سفر
میں ان میں سے بیشتر کہانیاں اپنی منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں مشاہدے
اور مطالعے کا خلوص ملتا ہے۔ لیکن یہاں کوئی "جوش" کوئی غصہ کوئی تلملاہٹ
نظر نہیں آتی جو ترقی پسند مصنفین کے یہاں ابتدا میں نظر آتی ہے۔ حالانکہ
یہ کہانیاں اسی زمانے کی پیداوار ہیں۔ لیکن ان کی تہہ میں ایک تند و تیز
طوفان کے آثار واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

پردیسی کے یہاں کشمیر کے قدرتی حسن کا بہت کم ذکر ملتا ہے۔ انہوں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

نے یہاں کے حسین جھرنوں، سدا بہار جنگلوں اور برفیلے پانیوں کا ذکر بھی بہت کم کیا ہے۔ اس کے برعکس انہوں نے یہاں کے تپتے ہوئے جہنم کدوں کی تصویر کشی کی ہے بھوک کو بہلاتے ہوئے کاریگروں کا ذکر ملتا ہے۔ بوجھ ڈھونے والے ہاتوؤں اور وڑداروں کے استحصال کے شکار کسانوں کا ذکر ملتا ہے۔ وہ نہ مصلح ہیں اور نہ سیاسی خطیب بلکہ ایک سچے فن کار کی طرح معروضی طور پر واقعات کی کڑیاں ملاتے جاتے ہیں۔ پردیسی کے نزدیک کشمیر کا سب سے بڑا مسئلہ غلامی اور افلاس ہے جس کی طرف کسی نے توجہ نہ کی۔ انہیں اپنے معاصرین اردو کے بیشتر غیر کشمیری افسانہ نگاروں سے شکایت ہے جنہوں نے کشمیر کو محض عیش گاہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ خود ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

"کشمیر کا ہر بدنصیب باشندہ خود ایک افسانہ ہے جس کی طرف آج تک کسی نے توجہ نہ دی۔ باہر کے چند نامور افسانہ نگاروں نے کچھ کہانیاں ضرور لکھیں مگر وہ بھی غلط انداز میں ...... یہاں پر سب سے بڑا مسئلہ غلامی ہے افلاس ہے"[1]

پردیسی کے فن کا آخری دور ۱۹۴۷ء کے آس پاس شروع ہوتا ہے۔ اب ان کے شعور میں پختگی پیدا ہو چکی تھی۔ ڈوگرہ شاہی کا شخصی نظام آخری ہچکیاں لے رہا تھا اس لئے ان کی تاناشاہی اور جور و استبداد میں اضافہ ہو چکا تھا۔ جاگیرداری نظام کے استحصال کے خلاف پردیسی نے بھرپور وار کیا۔ "بہتے چراغ" اور دوسرے غیر مطبوعہ مسودات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب ان کے لہجے میں زہرناکی پیدا ہو چکی تھی۔ وہ کشمیر کے مخصوص

---

[1] افسانہ الہ آباد نمبر ۸ - ص ۵

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

معاشرے کے تناظر میں کشمیریوں کے مزاج، ان کی اخلاقی قدروں ان کی آرزو مندیوں اور ان کی جدوجہدِ حیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ اس زمانے میں بالک رام باری اور کئی دوسرے ناموں سے بھی لکھتے ہیں۔ اس دور میں لکھی ہوئی کہانیاں پردیسی کی نمائندہ کہانیاں ہیں اور مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ زبان کا برتاؤ، لہجے کی چستی اور بیان کا اختصار بھی ان کے فن کو نکھارتا ہوا نظر آتا ہے۔ ریاست میں اس سے پہلے اردو کا مختصر افسانہ اس قدر منجھی ہوئی صورت میں نظر نہیں آتا۔ پردیسی نے کشمیر کو اپنے افسانوں میں پہلی بار پیش کیا اور ہزاروں لاکھوں کشمیریوں کو زبان بخشی۔ وہ پہلے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے ہندوستان کے بے شمار اردو پڑھنے والوں میں ہلچل پیدا کر دی اور ایک نئے لہجے میں اصلی کشمیر کی تصویر کھینچی جس کی طرف اس سے قبل صرف ہوس کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس لئے صحیح معنوں میں کشمیر میں اردو افسانے کی شروعات پردیسی سے ہی ہوتی ہیں۔

پردیسی کے قریبی معاصرین میں پریم ناتھ در کا نام اہم ہے۔ وہ پردیسی کے بعد اس میدان میں آئے اور بیسویں صدی کے چوتھے دہے میں اچانک اردو افسانے کے آسمان پر طلوع ہوئے۔ شروع شروع میں وہ پردیسی، رامانند ساگر اور دوسرے مقامی تخلیق کاروں کے ساتھ سرینگر کی ادبی انجمنوں میں شریک ہوئے لیکن انہوں نے اپنے فن کا لوہا ۱۹۴۷ء کے بعد منوایا۔ در کا بیشتر وقت کشمیر سے باہر گذرا لیکن وہ کسی حال میں بھی کشمیر کو نہیں بھولے۔ پردیسی کے ساتھ اور ان کے بعد جس افسانہ نگار نے کشمیریت کا احساس دلایا ان میں در کا نام سرِفہرست ہے۔ پردیسی ہی کی طرح در نے بھی کشمیر کی جنت کا ذکر بہت کم کیا ہے بلکہ بقول سید احتشام حسین "کشمیر جو بار بار ان کے افسانوں میں آتا ہے اپنی وہ جنت بدوش عظمتیں لئے ہوئے نہیں آتا جن سے رومانوں کا افسوں جگانے کے لئے فضا تیار ہوتی ہے۔ بلکہ ان میں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

وہ غم آلودہ اور نشتر آگیں کسک بھرتا ہے جس سے ہم کشمیر کی حقیقت کے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں۔"[1] اور وہی حقیقت یہاں کی ناداری، بھوک اور جاگیردارانہ نظام کی ماری ہوئی زندگی ہے۔ پریم ناتھ در کے ہاں غضب کا باریک مشاہدہ نظر آتا ہے۔ وہ اس بے چارگی اور لاچاری کی تہوں تک ٹٹول کر نیچے جاتے ہیں اور ان حقایق کو بے نقاب کرتے ہیں جس نے یہاں کے عوام کو افلاس اور بھوک کی اندھی غاروں میں دھکیل دیا تھا۔ در کے موضوعات ہماری آس پاس کی زندگی اور اس سڑتے ہوئے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں اور ان میں زندگی اس قدر قریب محسوس ہوتی ہے جیسے ہمارے پاس سانس لے رہی ہو۔ در کا فنی کمال اس تاثر اور فضا کے باعث ہے جن سے ان کا افسانہ عبارت ہے۔ اس کیفیت کو پیدا کرنے کے لیے ان کے اسلوب کی سادگی اور زبان و بیان کا متناسب استعمال کافی حد تک ذمہ دار ہے۔ ان کے یہاں تشبیہات اور استعارات کا ایسا نادر خزانہ ہے جس پر رشک آتا ہے۔ زبان کا برتاو غضب ڈھاتا ہے۔ اس ضمن میں ریاست کا کوئی افسانہ نگار ان کے مدِمقابل کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ پریم ناتھ در کے افسانوں کے صرف دو مجموعے شایع ہوئے ہیں۔ "کاغذ کا واسدیو" اور "نیلی آنکھیں"۔ اس کے علاوہ برصغیر کے رسالوں میں ان کے افسانے شایع ہو چکے ہیں اور نہ صرف یہ کہ ریاست میں ان کا نام ہے بلکہ اردو کے افسانوی ادب میں وہ ایک نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ در کا محبوب موضوع انسان اور انسانی سرشت ہے۔ ان کا یہ مطالعہ اس قدر گہرا ہے کہ اس پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ لاہور سے شایع ہونے والے

---

[1] پریم ناتھ در، "کاغذ کا واسدیو" (پیش لفظ)

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

معروف رسالے "ادبی دنیا" کے مدیر نامدار مولانا صلاح الدین احمد کو ایک زمانہ میں اردو کے افسانوی ادب میں جمود کا احساس ہوا تھا۔ لیکن جب درؔ نے اپنا افسانہ "غلط فہمی" اس میں شائع کروانے کے لئے بھیج دیا تو مولانا کو جمود ٹوٹنے کا یقین ہو گیا تھا کہ درؔ نے فن کا پرچم ان دیکھے میدانوں میں جا گاڑا تھا اور افسانوی حدود کو آگے بڑھایا تھا۔[۱]

پردیسی کے معاصرین میں کئی اور نام شامل کئے جا سکتے ہیں جنہوں نے ریاست میں اردو افسانے کو ترقی بخشا۔ اور اپنے اپنے انداز سے مختلف سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ ان میں سے بیشتر لوگ ٹیگور اور پریم چند کے ابتدائی دور کی کہانیوں سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے شائع نہیں ہوئے۔ البتہ یہ لوگ بھی کافی عرصہ تک لکھتے رہے اور مقامی اخبارات میں ان کی کاوشیں شائع ہوتی رہیں۔ ان میں خاص طور پر دینا ناتھ وارکو، تیرتھ کاشمیری، شیام لال ایمہ، ویرو لیششور، نندلال بے غرض، دنیا ناتھ دستگیر، اسیر کاشمیری، اخگر عکسری، کوثر سیمابی، کیف اسرائیلی، محمود ہاشمی، دیا کرشن گردش، عزیز کاش، محبوبہ یاسمین، صاحب زادہ محمد عمر، کاشی ناتھ کنول، گلزار احمد فدا جگدیش کنول، غلام سید رحیستی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

اسی دور کے آس پاس لکھنے والوں میں راما نند ساگر، قدرت اللہ شہاب نرسنگھ داس نرگس (امولارام کوٹی) کشمیری لال ذاکر، گنگا در دیہاتی کے نام بھی لئے جا سکتے ہیں۔ ساگر، شہاب اور ذاکر اب ریاست میں نہیں۔ لیکن ان کی کہانیوں میں اور خاص طور پر ابتدائی کہانیوں میں اس سرزمین کی بو باس

---

[۱] پریم ناتھ در: نیلی آنکھیں ص ۳

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کا احساس ہوتا ہے۔ شہاب مستقل طور پر پاکستان چلے گئے اور رامانند ساگر ہوری کدل کی گلیوں کو ترک کر کے بمبئی کی فلمی دُنیا کے گلیمر میں کھو گئے۔ ذاکر اپنے تخلیقی کارناموں میں مسلسل مصروف ہیں۔ انسانی زندگی اور استحصالی نظام میں پسے ہوئے عوام (شروع کی کہانیوں میں) ان کے خاص موضوع ہیں۔ اس پر ان کی قابل رشک زبان۔ ذاکر نے اردو کی افسانوی دُنیا میں اپنا مقام بنا لیا ہے۔ گنگا دھر دیہاتی بڑے زود نویس تھے۔ کافی عرصہ تک صحافت کے ساتھ وابستہ رہے۔ دیہاتی اور دل کش کاشمیری کے قلمی نام سے ریاستی اور ملکی رسائل میں کہانیاں لکھتے تھے۔ انہوں نے بہت پہلے سے ہی کہانیاں لکھنا شروع کی تھیں جو کافی مقبول ہوئیں۔ دیہاتی نے بھی اپنے معاصرین کی طرح سیاسی اور سماجی مسائل کو اپنا موضوع بنا لیا تھا۔ اُنہوں نے معاشی اور اقتصادی بدحالی، سرمایہ اور محنت کی کشمکش اور اپنے عہد کے دوسرے سماجی مسائل کو کہانیوں میں ڈھالا تھا۔ ان کا کوئی مجموعہ شائع نہ ہو سکا کہانی کے فن اور تکنیک کی تازہ کاری کا جو ہر ادراک دیہاتی کو تھا۔ ریاست کے بہت کم کہانی کاروں کو حاصل ہو سکا۔ نرسنگھ داس نرگس عرصہ دراز تک مولا رام کوٹی کے نام سے لکھتے رہے۔ ان کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "دُکھیا سنسار" اہم ہے۔ صحافت سے وابستہ ہونے کے باوجود نرگس بہت اچھی کہانیاں لکھتے رہے۔ ان کی کہانیوں میں دیہاتی زندگی کی عکاسی خاص طور پر نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی اپنے وطن کی بدحالی اور جاگیردارانہ نظام کے استحصال کو اپنی کہانیوں میں بے نقاب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نرگس نے دیہاتیوں کی آرزو مندیوں پر خاص طور پر توجہ کی ہے۔ ان ارمانوں کے پس پشت غم اور ملال کی دھیمی دھیمی آنچ ملتی ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد اردو افسانہ کئی زینے طے کرتا ہوا آگے بڑھا ہے — ن ف

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

موضوع کے اعتبار سے افسانے کا کینڈا بدل گیا ہے بلکہ فن تکنیک اور تکنیک کے برتاؤ
کے اعتبار سے بھی افسانہ کہیں سے کہیں پہنچا ہے۔ اس دور سے قبل اور اس کے
بعد پردیسی، در، دیہاتی، ذاکر مسلسل لکھتے رہے۔ لیکن اس فہرست میں کئی
اور ناموں کا اضافہ ہوا۔ خصوصی طور پر ٹھاکر پونچھی، موہن یاور وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے
جنہوں نے ۱۹۴۷ء سے قبل ہی لکھنا شروع کیا تھا۔ وہ اپنے چونکا دینے والے
انداز تحریر سے قارئین کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ ۴۷ء کے بعد ان کے فن نے ترقی کی
منزلیں طے کیں۔ ٹھاکر نے اپنے افسانوں میں پونچھ اور جموں کے آس پاس کی
زندگی کے رنگ بھر دیئے ہیں۔ اور اپنے منفرد اسلوب سے اپنا مقام بنا لیا۔ موہن یاور
منجھے ہوئے فن کار ہیں۔ وہ کہانی کے فن پر قادر ہیں۔ منٹو اور بیدی کی طرح الفاظ
کے کم از کم استعمال سے تاثر کی وحدت قائم کرتے ہیں۔ وہ شاعری نہیں کرتے اور
اس راز کو سمجھ گئے ہیں کہ مختصر افسانہ اختصار اور کفایت الفاظ کا فن ہے۔ موہن کے
یہاں عصر حاضر کے انسان کا درد وکرب ملتا ہے۔ "سیاہ تاج محل" "وسکی کی بوتل" اور "تیری
آنکھ" میں موہن یاور کے فن کی پختگی کا احساس ہوتا ہے۔

۱۹۴۷ - ۱۹۴۸ء میں ہماری ریاست سیاسی اعتبار سے ایک نئے مرحلے
میں داخل ہوئی۔ اس کا اثر لازمی طور پر یہاں کی سماجی، ثقافتی اور ادبی زندگی پر
بھی پڑا۔ نئے تقاضوں کے پیش نظر "قومی کلچرل فرنٹ" کی بنیاد پڑی اور گوشہ
نشینی میں پڑے ہوئے ہمارے فن کار بھی میدان میں کود پڑے۔ کلچرل فرنٹ کی بنیادوں
پر کلچرل کانگریس کی عمارت کھڑی ہوئی اور یہاں سے ہماری ثقافتی اور ادبی زندگی کا
احیائے نو ہوتا ہے۔ کلچرل کانگریس کے سائے تلے ڈوگری اور کشمیری زبانوں کے
شعرا و ادبا [illegible] سامنے آیا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اردو افسانے کے میر کارواں پریم ناتھ پردیسی ہی تھے۔ نئے لکھنے والوں میں سوم ناتھ زتشی، علی محمد لون، اختر محی الدین، بنسی نردوش، دیپک کول، تیج بہادر بھان، ویدراہی اور کچھ عرصہ بعد پشکر ناتھ، حامدی کاشمیری، برج پریمی، اُمیش کول، ہری کرشن کول، غلام رسول سنتوش، جگدیش بھارتی، برج کتیال، نیدسیمی، نورشاہ، محمود بدخشی، وجیہہ احمد اندرابی، رام کمار ابرول وغیرہ اس کارواں میں شامل ہوتے اور اپنی کہانیوں میں نئے تقاضوں کی ترجمانی کی۔ ان لوگوں کے یہاں موضوع اور ہیئت کے لحاظ سے نئے تجربے ملتے ہیں۔ یہ افسانہ نگار ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ اس لئے ان کے یہاں محنت کش طبقہ اور ریاستی عوام کی ترجمانی کا احساس ہوتا ہے۔ اس دور تک آتے آتے ہمارا افسانہ قدیم روایتوں سے انحراف کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ چنانچہ ان افسانہ نگاروں کے یہاں خالی خولی رومان کے رنگ نظر نہیں آتے بلکہ حقیقت کی تلخیاں سامنے آتی ہیں۔ اس لئے ان کے یہاں بعض اوقات طنز کے تیکھے وار بھی ملتے ہیں اور ایک خصوصیت جو اس دور کے کہانی کاروں میں عام طور سے نظر آتی ہے وہ کشمیر اور کشمیریت کا احساس ہے۔ افسانے کے فارم میں ڈھلنے کی اس روش کی توسیع ایک نئے انداز سے ہوتی ہے جس کی طرح پردیسی اور ذر نے ڈالی تھی۔

اختر محی الدین نے اپنے ادبی سفر کا آغاز اردو افسانہ نگاری سے کیا اس کے بعد وہ کشمیری میں لکھنے لگے۔ کشمیری زبان کے افسانہ نگاروں میں آج ان کا نام سرِ فہرست ہے لیکن اردو میں ان کی شروعات کسی طرح بھی کم تر درجہ کی نہیں۔ "پونڈرچ" نام کی کہانی میں انہوں نے اپنے باطن کا کرب جس طرح انڈیل دیا تھا وہ ان پر ختم ہے۔ یہ کہانی اُس سال کی بہترین کہانی قرار دی گئی اور ایک غیر ریاستی اخبار کے "مختصر افسانہ کے مقابلے" میں پہلے نمبر

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پر آگئی تھی۔ اختر کی کہانیوں میں مشاہدے کی گہرائی ملتی ہے وہ اپنی بات برجستہ انداز میں کہتے ہیں۔ اسلوب میں مزاح کی چاشنی ہے اور مزاح کی شکر میں لپٹا ہوا طنز اسے دو آتشہ بنا دیتا ہے۔ تیج بہادر بھان ۱۹۵۱ء سے لکھتے آ رہے ہیں اور اب تک لکھ رہے ہیں۔ کلچرل کانگریس کے ساتھ وابستگی کے باعث شروع میں "لال چُنری" اور "سرمایہ دار کا خواب" جیسی کہانیاں لکھیں۔ ان کہانیوں میں فن سے زیادہ پروپگنڈے کی بو آتی ہے لیکن وقت گذرنے کے ساتھ تیج کا فن نکھرتا گیا اور آج ان کے یہاں کہانی کے فن کا ایک بھرپور اور نکھرا ہوا انداز ملتا ہے۔ تیج اس فن میں کسی کے مقلد نہیں۔ وہ نہ کسی فارمولے کے پابند ہیں اور نہ کسی تکنیک کے۔ اُنہوں نے اپنے لئے ایک مخصوص تکنیک وضع کی ہے۔ تیج نے کلچرل کانگریس کے زمانے میں ہی اپنی کہانی "واٹکین" سے لوگوں کو چونکا دیا جو خواجہ احمد عباس کے رسالے "سرگم" میں چھپی تھی اور جس نے انعام بھی حاصل کیا تھا۔ تیج کے یہاں زبان کا برتاؤ عام طور سے عدم صحت کی وجہ سے ان کی معترضین کا نشانہ رہا ہے۔ تیج سے انشاء اور املا کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں لیکن مختصر افسانے کے لئے جس تکنیک اور جس فنی چابکدستی کی ضرورت ہے ہمارے یہاں شاید ہی کسی افسانہ نگار کو اس کمال کی ہنر مندی حاصل ہے اور اس سلسلے میں ان کا کوئی مدِمقابل نہیں۔ "جہلم کے سینے پر" سے "عورت" تک تیج نے خاصا تخلیقی سفر طے کیا ہے۔ تیج کے خاص موضوعات میں نفسیاتی اور سماجی مسائل ہیں جن کو انہوں نے تخلیقی آرٹ کے حسن کے ساتھ پیش کیا ہے۔

دیپک کول میں ایک اچھے کہانی کار کی سب خوبیاں موجود تھیں۔ لیکن اب وہ ہندی میں لکھنے لگے ہیں اور عرصے سے اردو میں ان کی کوئی کہانی نظر سے نہیں گذری ہے۔ دیپک بھی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اور کلچرل کانگریس

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کے سرگرم رکن تھے۔ دیپک کول کی زبان قابل رشک تھی۔ ہندی اور اردو کی آمیزش سے انہوں نے اپنا اسلوب نکھارا تھا۔ ان کے موضوعات میں بھی وقت کے تقاضوں کی گونج تھی۔ رشید رکی کے نام ایک خط، جب گدھ ڈوب گئے، بات کل رات کی، ناقابل فراموش کہانیاں ہیں۔ اُمیش کا "یاقوت" دائرے اور مرکز، بنسی نردوش کا "تار سوت" لون کا پانی، پجاری بُت شکن اور سکھ کا ساحل، سنتوش کا "خزاں کی خوشبو" اسی دور میں لکھی گئیں اور توجہ کا مرکز بن گئیں۔

پُشکر ناتھ دور حاضر کے اہم کہانی کار ہیں۔ ان کے تین مجموعے "اندھیرے اجالے" "ڈل کے باسی" اور "عشق کا پہاڑ اندھیرا" شائع ہو چکے ہیں۔ پُشکر نے ایک رومان نگار کی حیثیت سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا وہ "بیسویں صدی" دہلی کے توسط سے کشمیر میں پہنچانے گئے لیکن بہت جلد انہوں نے اپنے منصب کو پہچان لیا اور رومانوں سے اُتر کر انہوں نے کشمیر کی زندگی کے کرب کو اپنے افسانوں میں ڈھال دیا۔ پُشکر کا مشاہدہ عمیق ہے وہ فلسفہ نہیں بگھارتے اور نہ سیاست کے کرتب دکھاتے ہیں (وہ) روزمرہ کی زندگی سے اپنی کہانیوں کا مواد اخذ کرتے ہیں۔ پُشکر ناتھ کی کہانیوں (میں) جذبے اور احساس کا ادراک ملتا ہے اور ایک منجھا ہوا شعور بھی۔ ان کو زبان وبیان پر قدرت حاصل ہے جس کی مدد سے انہوں نے خوب سے خوب تر لکھا ہے۔ پُشکر نے اپنے طویل تخلیقی سفر کے دوران فارم کے کئی تجربے کئے ہیں۔ کئی کہانیاں انہوں نے ناول کی تکنیک میں لکھی ہیں بعض میں داستانی تکنیک کا التزام کیا ہے اور بعض میں صرف بیانیہ انداز ملتا ہے۔ کہیں کہیں چشمہ شعور کی تکنیک کو بھی برتا ہے پُشکر بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ بدلے ہیں۔ مشاہدے کے ساتھ ساتھ ان کے مطالعے کا آہنگ بھی ان کی نئی کہانیوں میں نظر آتا ہے۔ "کہانی پھر ادھوری رہی"

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سے لے کر "عشق کا چاند اندھیرا" تک پُشکر نے ایک طویل تخلیقی سفر طے کیا ہے اِدھر حالیہ برسوں میں انہوں نے چند کہانیاں ایسی بھی لکھی ہیں جن میں ابہام، علایم، تجریدیت اور جدید کہانی کی بیشتر خصوصیات کو شعوری طور پر اپنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ افسانے میں "قصہ پن" کی خصوصیت سے اجتناب نہیں کر سکے ہیں۔

نُور شاہ بنیادی طور شاعرانہ ذہن رکھتے ہیں۔ ان کا اسلوب بھی شاعرانہ ہے جس سے ان کی کہانیوں میں قوس و قزح کے رنگ آ گئے ہیں۔ اور اس خصوصیت نے نُور کے افسانوں کو ایک انفرادیت بخش دی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ نُور شاہ افسانہ بُننے کے گُر سے بھی واقف ہیں۔ وہ انسانی زندگی کی مجبوریوں اور ناکامیوں کی کہانیاں لکھتے ہیں جس سے ان کے افسانوں میں غم کی ہلکی ہلکی کسک پیدا ہو گئی ہے۔ انسانی نفسیات کا مطالعہ بھی نور شاہ کے متنوع موضوعات میں شامل ہے۔ بے گھاٹ کی ناؤ، من کا آنگن اُداس اُداس اور رنگیلے پتھروں کی مہک جیسے کئی افسانے قابلِ قدر ہیں اور ہمارے افسانوی ادب میں اضافہ۔

حامدی ایک اور اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے 'وادی کے پھول'، برف میں آگ، سراب وغیرہ شایع ہو چکے ہیں۔ حامدی بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ یہی شاعرانہ اسلوب ان کے افسانوں کی مانگ کا سیندور ہے شروع میں ان کے یہاں ترقی پسند تحریک کا غیر واضح اثر جھلکتا ہے اور وہ سماجی مسایل کی طرف توجہ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بعد میں انہوں نے اپنے شخصی تجربات کو افسانہ کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی اور سماجی اقدار کی پامالی، رشتوں کی شکست و ریخت اور دوہری شخصیت کی نفسیات کے موضوع پر کئی کامیاب افسانے لکھے۔ اس ضمن میں ان کا افسانہ 'المحور' کا سفر' مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ حامدی کا جدیدیت کے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

رجحان سے متاثر ہیں اور ابتدائی دور کی رومانی اور سماجی کہانیوں سے داخلیت کے پیچیدہ رجحان تک ان کے یہاں کئی تجربے ملتے ہیں۔

اس دور کی دوسری اچھی کہانیوں میں برج کتیال کی "موت کے راہی" مخمور بدخشی کی نیل کمل مسکائے، "یہ خلش کہاں سے ہوتی" برج پریمی کی ہنسی کی موت "سپنوں کی شام" "چلمن کے سائیوں میں" اتیش کول کی "دائرے اور مرکز" ہری کرشن کول کی کئی کہانیاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کہانی کاروں کے یہاں بھرپور عصری شعور ملتا ہے۔ ان میں بہت سے افسانہ نگار اب تک مسلسل لکھ رہے ہیں۔ چنانچہ تیج بہادر بھان، کشمیری لال ذاکر، تیج کرناتھ، موہن یاور، برج پریمی، نور شاہ اور بہت سے دوسرے لوگ اردو افسانے کی آبیاری کر رہے ہیں اور فکر و شعور کی پختگی کے ساتھ نئے فنی تجربوں میں مشغول ہیں۔

۱۹۶۵ء کے آس پاس اردو میں نئے افسانے کی شروعات ہوتی ہیں اور اب افسانہ نئی سمتوں کی طرف مڑنے لگتا ہے۔ نہ صرف موضوعاتی تازگی اور اسلوب کی شادابی کے لئے راہیں متعین ہونے لگتی ہیں۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ افسانہ زندگی کی بدلتی ہوئی کیفیتوں کو منعکس کر رہا ہے۔ زندگی میں جو انتشار اور اضطراب پیدا ہوا ہے۔ اُسی سے افسانہ عبارت ہو گیا ہے۔ سائنس اور ٹکنیک کی تبدیلیوں نے جہاں دوسری تبدیلیاں پیدا کی ہیں وہاں عقائد ٹوٹ گئے ہیں۔ انسان ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن گیا ہے۔ زندگی کے مسائل سے نبرد آزمائی اور قدروں کی شکست و ریخت کی وجہ سے فن کار بھی خارج سے باطن کی طرف مراجعت کرنے لگ گیا ہے۔ اردو کا افسانہ آہستہ آہستہ عصری زندگی کے ان مسائل کو سمیٹتا ہوا، روایت سے انحراف کرتا ہوا نئے علائم، تشبیہہ و استعارات کے سہارے سے آگے بڑھنے لگتا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہے۔ یہ خارجی اور معروضی سمتوں سے دامن بچاتا ہوا موضوعی، داخلی و ذاتی بننے لگتا ہے اسلوب میں سادگی، سپاٹ پن، غیر مرصع اور غیر رنگین انداز پیدا ہونے لگتا ہے اور افسانہ تجریدی اور علامتی شکل اختیار کرنے لگتا ہے لیکن اس صورت حال کا فوری ردعمل ہمارے یہاں نہیں ہوتا۔ یہ تبدیلیاں ابھی حالیہ برسوں میں ہمارے بعض افسانہ نگاروں کے یہاں پیدا ہونے لگی ہیں۔

۱۹۶۰ء، ۱۹۶۵ء کے بعد ہمارے یہاں نئے افسانہ نگاروں کا ایک کارواں جنم لیتا ہے۔ یہ لوگ جیسا کہ ذکر ہوا فوری طور پر جدیدیت کے میدان سے متاثر نہیں ہوئے البتہ دوسری قومی اور بین الاقوامی سیاسی، ثقافتی اور ادبی تحریکوں سے ضرور متاثر ہوتے ہیں۔ مارکس واد اور فرائڈ کی جنسی نفسیات اور تحلیل نفسی کے اثرات تو بہت پہلے رونما ہوتے تھے۔ اب کھل کر سامنے آنے لگتے ہیں لیکن ہند چینی سرحدی تنازع کے باعث ترقی پسند تحریک کو جو دھچکا ہندوستان میں لگا اس کے باعث ترقی پسند رجحانات ڈھیلے پڑنا شروع ہوئے البتہ جنسی نفسیات اور جنسی بے راہ روی کے موضوعات بطور خاص برتے جانے لگے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بعض یورپین ادبی میلانات راہ پانے لگے۔ نئے کہانی کاروں میں عمر مجید، کشوری منچندہ، نریندر پٹواری، شمس الدین شمیم، مالک رام آنند، اوپی۔ ساتھی، ہرش سروج، ڈی کے کنول، امر مالموہی، رتیش گوہر، گلدیپ رعنا، موتی لال کپور، جوگیشور نمبھک، زماں آزردہ، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ سب باصلاحیت کہانی کار ہیں اور انہوں نے نہ صرف روایتی انداز کی کہانیاں لکھی ہیں بلکہ روایت سے انحراف کرکے نئے اور تازہ موضوعات کو اسلوب کی ندرت اور تازہ کاری سے اردو افسانے کو ترقی کی نئی سمتیں عطا کی ہیں۔ ان کے یہاں ہلکے پھلکے رومان بھی نظر آتے ہیں اور عصری زندگی کی تلخ تمنائیں بھی ملتی ہیں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اردو افسانہ ریاست میں کسی جمود کا شکار نہیں۔ یہاں کے کہانی کار اپنے خون جگر سے اسکی آبیاری کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں اور عصر حاضر کے انسان میں جو بے سرو سامانی کرب اور تنہائی کا احساس پیدا ہوا ہے۔ اسکی ترجمانی جدید دور کے افسانہ نگار کر رہے ہیں۔ ان میں خاص طور پر آنند لہر، انیس ہمدانی، غمگین غلام نبی، سومناتھ ڈوگرہ، راجہ نذر بونیاری، مسعود ساموں، جان محمد آزاد، فاروق رینزو، نظیر ندر، زاہد مختار، کے ڈی مینی، اشرف آثاری، یاسین فردوسی، عبدالرشید فراق اور غلام رسول آزاد کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ ان افسانہ نگاروں کے تجربوں میں وہ وسعت نہیں ہے جو انکے پیش روؤں میں موجود تھی لیکن انکے بعض افسانوں کو پڑھ کر یہ بات وثوق کیساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان کا مستقبل درخشاں ہے۔

ریاست میں اردو افسانہ مقابلتاً ایک کم سن صنف ہے اور بات کے باوصف کے یہاں کے کہانی کاروں کو اپنے افسانوں کی اشاعت کے سلسلے میں وہ سہولیات اور مواقع میسر نہیں ہوئے یہاں اردو افسانہ نگاری کے میدان میں جو کام ہوا ہے وہ فنی لحاظ سے تیسرے درجے کی چیز نہیں ہے بلکہ بعض کہانیاں ایسی ہیں کہ انہیں بلا مبالغہ اردو کی بہترین کہانیوں کے ادب میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اردو نثر جموں و کشمیر میں

ہماری ریاست میں اردو زبان کی عمر بھی کوئی سوا سو سال کے آس پاس ہو گی۔ سالہا سال تک یہاں افغانوں اور سکھوں کی حکمرانی رہی اور ہم غلامی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ اس زمانہ میں فارسی زبان و ادب کا چلن رہا۔ کشمیریوں نے اپنی ذہانت کا ثبوت فراہم کر کے اس زبان میں قابل قدر سرمایہ پیدا کیا۔ لیکن جب ڈوگرہ عہد کا آغاز ہوا اور مہاراجہ گلاب سنگھ (۱۸۴۶-۱۸۵۷ء) کو برطانوی مفادات کے تحفظ کے پیش نظر کشمیر کو خریدنے کا موقعہ فراہم کیا گیا اور ریاست جموں کشمیر کی حکومت قائم ہوئی تو سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر دہلی اور لاہور کی حکومتوں کیساتھ تعلقات استوار ہونے اور باہر آنے جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ عام لوگوں کی سطح پر بھی بہ سلسلۂ تجارت اور وسائل معاش کی تلاش میں ان تعلقات میں اضافہ ہوا۔ اس اختلاط کا منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ باہر جانے والے سیلانی اپنی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

فارسی دانی کے بدولت مروجہ اردو میں شد بد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ کشمیر کی آبادی کا خاصا حصہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران بعض سیاسی وجود سے ہندوستان کے دوسرے حصوں میں ہجرت کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ان میں سے اکثر خاندان وہیں کی خاک میں جذب ہو گئے اور اردو زبان کی تیز رفتار ترقی سے متاثر ہو کر انہوں نے شعر و ادب کے ایسے نادر گل بوٹے سجائے جنکا اپنا الگ مقام ہے۔ ہم یہاں ان کارناموں سے بحث نہیں کرینگے۔

ڈوگرہ سلطنت کے بانی مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں ریاست کی درباری زبان فارسی تھی لیکن جموں کے بلیشتر علاقے کی زبان ڈوگری تھی جو لسانی اعتبار سے پنجابی اور اردو کے قریب ہے اس لئے اردو زبان اپنے ادبی خدو خال مرتب کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۵۷-۱۸۸۵ء) کا عہد مقابلتاً امن و سکون کا زمانہ تھا۔ مہاراجہ نے وقت کے تقاضوں کے مطابق نئے علوم و فنون اور تعلیم کو اپنی ریاست میں رائج کرنے کیلئے کافی دلچسپی کا اظہار کیا۔ لوگوں کو مغربی علوم و فنون سے آشنا کرنے کیلئے انگریزی تعلیم کے مدرسے قائم کئے۔ اپنے دربار میں عالم اور فاضل جمع کئے۔ انمیں سے بلیشتر فارسی کے عالم تھے لیکن اردو زبان بولتے اور لکھتے تھے۔ مہاراجہ کا وزیر اعظم دیوان کرپارام تھا۔ جو علاوہ انتظامی قابلیت کے علم و فن میں بھی دخل رکھتا تھا۔ وہ کئی فارسی کتابوں کا مصنف تھا۔ مہاراجہ کی حیات اور انتظام حکومت سے متعلق اسکی فارسی تصنیف "گلاب نامہ" آج بھی اہل نظر کی آنکھ کا سرمہ ہے صوفی کے مطابق دیوان کرپارام رنبیر سنگھ کے دربار کا ابوالفضل تھا۔ کرپارام فارسی کا ایک اچھا مصنف اور مورخ ہونے کے علاوہ اردو زبان میں بھی دست رس رکھتا تھا۔ اسکی وفات ۱۸۷۶ء میں ہوئی۔ وہ پہلا شخص تھا جسنے ریاست کی انتظامی صورت حال پر رپورٹیں مرتب کرنا شروع کیں اور انکی اشاعت کا اہتمام کیا۔ یہ رپورٹیں اردو

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

میں مرتب کی جاتی تھیں۔ سال ۱۸۷۳-۱۸۷۴ کی رپورٹ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"افسوس ہے کہ جب سے روز بروز اور جنسوں کی تجارت میں افزائی ہوتی جاتی ہے۔ تجارت پشمینہ میں کساد و بے رونقی ہے چنانچہ نیلام ۱۸۷۳ء میں ایک روپیہ کے عوض آٹھ آنہ سے لیکر دس آنہ تک قیمت آئی و نیز خریداران فرانس خریداری مال پشمینہ سست ہوا لہذا اکثر کارخانہ شال بافی بہ سبب کم ملنے قیمت پشمینہ کے خراب ہوئے۔"

اس نمونہ کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ زبان مقابلتاً صاف اور شستہ تھی۔ وجہ ظاہر ہے کہ اس زمانہ تک آتے آتے اردو نثر کا اسلوب کافی نکھر گیا تھا جس سے یہاں کے لکھے پڑھے لوگ آہستہ آہستہ متعارف ہو چکے تھے۔ سر سیدؒ کی تحریک کے بعد لاہور میں انجمن پنجاب کا بھرم اب بھی تھا لیکن اسمیں وہ دم خم نہیں رہا تھا۔ مدنظر رہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے جب حکومت کی عنان سنبھالی اور ابتدائی برسوں کی مشکلات کے بعد حکومت میں استحکام پیدا کیا تو اسے علوم و ادب کی اشاعت کا خیال آیا چنانچہ دوسرے کارناموں کے علاوہ اس نے جموں میں ایک سنسکرت کالج قائم کیا۔ ایک شاندار لائبریری اور ایک دارالترجمے کا اہتمام کیا۔ اس دارالترجمے کے توسط سے سنسکرت اور فارسی کی کتابیں شائع ہوئیں۔۔ اور بہت سے مسودات ڈوگری، ہندی اور اردو میں ترجمے ہوئے۔ اس ادارے کے زیر اہتمام ریاستی نظم و نسق سے متعلق کئی رپورٹیں مرتب ہوئیں۔ ۱۸۸۲-۱۸۸۳ء کے دوران تیار کی ہوئی ایک رپورٹ ذیل درج ہے:-

"۵۰۲۴ روپیہ اجرت ترجمہ اس سال میں صرف ہوا اور سال حال میں کوئی کتاب جو انگریزی سے شاستری اور شاستری بھاشا

[illegible]

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اور عربی سے اردو میں ترجمہ ہوئی ہیں، ختم ہوئی ہیں۔"

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کی کتابیں جو عربی یا دوسری زبانوں سے اردو میں منتقل ہوئی تھیں انکو باضابطہ طور پر شائع کیا جاتا تھا اور اسکی چھپت ہوئی تھی اس عہد کے کئی مسودات ملتے ہیں جنمیں سے اکثر انگریزی فارسی اور عربی سے اردو میں ترجمہ ہوئے ہیں اور ساتھ ساتھ دیوناگری حروف میں بھی لکھے گئے ہیں۔ ان مسودات کی تیاری میں غلام غوث خان، پنڈت بخشی رام، مولوی افضل الدین ملا نسبت رائے کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ مہاراجہ کے دربار کے ساتھ منسلک تھے اور انہوں نے طب، انجینرنگ، منطق، تاریخ، مذہب، کاغذ سازی، اناٹومی وغیرہ سے متعلق مسودات تیار کئے۔ انکے مسودات میں زبان کا اسلوب صاف ستھرا ہے کہیں کہیں دبی چاشنی ملتی ہے۔ جہاں کہیں انگریزی اصطلاحات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہاں ان کو جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔

یہ بات اہم ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں ابھی اردو زبان کو ریاست کی سرکاری زبان ہونے کا منصب عطا نہیں ہوا تھا لیکن زبان عام پڑھے لکھے لوگوں میں مقبول ہو رہی تھی۔ چنانچہ دارالترجمہ کے دائرۂ عمل سے باہر بھی کئی نثری کارنامے وجود میں آئے مہتہ شیر سنگھ نے ۱۸۶۶ء-۱۸۶۷ء کے دوران ایک سفرنامہ لکھا۔ یہ سفرنامہ پڑوسی ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات کو استوار کرنے کے پیش نظر لکھا گیا تھا۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے کارناموں میں "بدیا بلاس پریس" کا قیام بھی شامل ہے جو ۱۸۶۷ء میں عمل میں لایا گیا۔ یہ ریاست کا پہلا پریس تھا۔ اسی سال ریاست کا پہلا اخبار "بدیا بلاس" سرکاری گزٹ کے طور پر جاری کیا گیا۔ یہ اخبار اردو اور ہندی دونوں حروف میں شائع ہوتا تھا۔ اس عہد کے اہم ادیبوں میں ہرگوپال خستہ کا نام سرفہرست ہے خستہ شبلی اور حالی کے معاصر تھے۔ وہ کشمیری الاصل تھے اور سال ہا سال ریاست سے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

باہر لاہور اور پٹیالہ میں رہ چکے تھے۔ قیام لاہور کے دوران وہ "راوی" "رفاہ" "خیر خواہ کشمیر" "دیش کی پکار" اور اس قبیل کے کئی پرچوں کے ساتھ وابستہ رہ چکے تھے۔ لاہور میں ان کا تعارف پنجاب کے ڈائریکٹر تعلیمات کرنل ہالرائیڈ کیساتھ ہو چکا تھا۔ وہ انجمن پنجاب کی کارکردگیوں سے بھی واقف تھے۔ اس لئے نہ صرف یہ کہ وہ اپنے عہد کے نئے خیالات تصورات سے واقف تھے بلکہ اردو زبان کے مزاج سے بھی واقف تھے۔ خستہ اعلیٰ پایہ کے شاعر اور نثر نگار تھے وہ ۱۸۷۵ء میں کشمیر لوٹے اور آتے ہی اپنی خداداد قابلیت کی وجہ سے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار کیساتھ وابستہ ہو گئے۔

خستہ کے کئی نثری کارنامے ہیں۔ انکی "گلدستہ کشمیر" اردو نثر میں غالباً کشمیر کی پہلی تاریخ ہے۔ جو عہد قدیم سے لیکر مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد کا احاطہ کرتی ہے یہ کتاب ۱۸۸۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ خستہ رنبیر سنگھ کے عہد کے چشم دید گواہ تھے۔ اس لئے تاریخی اعتبار سے بھی اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے۔ کتاب نہایت شستہ اور صاف ستھری زبان میں لکھی گئی ہے اور اس ثقالت سے پاک ہے جو اس سے قبل کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ اردو کے نثری شعبے میں یہ قابل قدر کارنامہ ہے خستہ کی دوسری تصنیف رسالہ "گلزار فوائد" ہے۔ یہ دراصل ایک قصہ ہے جسمیں ڈپٹی نذیر احمد کے مراۃ العروس کا تتبع کیا گیا ہے۔ اسلوب سلیس اور واضح ہے کہیں کہیں مقفیٰ اور مسجع عبارت کا التزام کیا گیا ہے خستہ کے کارناموں میں انکے انشائیے بھی شامل ہیں۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے انتقال کے بعد مہاراجہ پرتاپ سنگھ ۱۸۸۵ء میں تخت نشین ہوئے اس عہد تک اردو پڑھے لکھے لوگوں کا حلقہ بڑھ گیا تھا اور اردو زبان ذریعہ اظہار بن گئی تھی۔ مہاراجہ نے اس زبان کی مقبولیت کے پیش نظر ۱۸۸۹ء میں اسے سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کر لیا۔ سرکاری [illegible] کی حاصل ہے [illegible] یہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

زبان ریاست کی سماجی اور سیاسی میں اپنا شاندار رول ادا کرنے لگی اور تعلیمی اداروں سرکاری محکموں اور عدالتوں میں استعمال ہونے لگی۔

ہرگوپال کول خستہ کے بھائی سالگ رام کول سالک اس عہد کے دوسرے اہم نثر نگار ہیں۔ سالک کا ادبی ذوق بھی لاہور کی ادبی فضاؤں میں پروان چڑھا تھا۔ کافی عرصہ تک "اودھ اخبار" لکھنؤ میں مضامین لکھتے رہے۔ انہوں نے خود بھی لاہور سے "خیر خواہ کشمیر" نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا تھا۔ اسی عہد میں عیسائی مشنریوں اور مبلغوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ مغربی خیالات کی توسیع ہونے سے اور عیسائیت کی تبلیغ کو روکنے کے لئے مختلف مذاہب کے پڑھے لکھے لوگوں میں ہلچل پیدا ہوئی آریہ سماج نے بھی اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔ سالک نے مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی سرپرستی میں سناتن دھرم سبھا کا کام سنبھالا۔ آریہ سماجی پرچار کے خلاف اور سناتن دھرم کی حمایت میں کئی کتابچے لکھے اور شائع کروائے۔ ان میں "درگی نندن" "دھرم اپدیش" اور "شاستر ارتھ" قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ "لغات اردو" اور "محاورات اردو" کے نام سے دو چھوٹی کتابیں مرتب کیں۔ سالک نے کئی قانونی کتابیں بھی مرتب کیں۔ رنبیر دنڈ بدھی "قانون تعزیرات جموں و کشمیر" کی مبسوط شرح اس ضمن میں ان کا خاص کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ مجموعہ ضابطہ دیوانی قانون رجسٹری اور دوسری قانونی دستاویزات کی شرح بھی لکھی ہے۔ سالک نے اردو کتابوں کی اشاعت کے لئے ایک پریس بھی قائم کیا تھا جس کا نام "سالگرام پریس" تھا۔ سالک نے گلاب سنگھ کی حیات کا ترجمہ بھی اسی زمانے میں کیا۔ خالص ادبی کارناموں میں ایک اچھی کتاب "گنجینہ فطرت یا مناظر فطرت" کے نام سے شائع ہوئی ہے فطری سلیس، دل کش اور رواں اسلوب میں یہ اپنی طرز کے انشائیے ہیں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

جن میں کشمیر کے مناظر کو بیان کیا گیا ہے۔ سالک کا ایک اور کارنامہ "داستان جگت روپ" ہے جو کسی وجہ سے شایع نہ ہو سکا۔ یہ کتاب قصہ کے پیرایے میں لکھی گئی ہے۔ "تحفہ سالک" ایک سفرنامہ ہے جس میں دوسرے ممالک کی تواریخ اور جغرافیہ کا سہارا لیکر وہاں کی ترقی کا حال لکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں قصے کی تکنیک کا التزام کیا گیا ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں لاہور اور دوسری جگہوں سے ریاست کا رابطہ اخبارات کے ذریعے قایم ہوا۔ ان اخبارات میں ریاست کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسایل پر مضامین شایع ہونے لگے جس سے یہاں کے پڑھے لکھے لوگوں میں صحافت سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور لکھنے والوں کی صلاحیت کو اُبھرنے کا موقعہ دستیاب ہوا۔ محمد دین فوق کی مساعی اس ضمن میں سب سے نمایاں ہے۔ فوق نے لاہور اور کشمیر سے مختلف اخبارات جاری کئے اور اپنے قلم کی تمام توانائیوں کے ساتھ اہل کشمیر کو غفلت کی نیند سے بیدار کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔ فوق ایک عظیم مورخ صحافی تذکرہ نگار اور نثر نگار تھے۔ انہوں نے متنوع موضوعات پر قلم اٹھایا وہ بہت زود نویس بھی تھے اور درجن بھر اخبارات اور رسایل کے ساتھ وابستہ رہے۔ ناول، افسانہ، سوانح، تذکرہ، تاریخ کے شعبوں میں ان کے متعدد نثری کارنامے موجود ہیں وہ اپنے عہد کے سب سے بڑے ادیب ہیں۔ ان کی تصانیف میں تاریخی کتابوں، تذکروں، ناولوں، ڈراموں اور دوسرے نثری کارناموں کی تعداد لگ بھگ سو تک جا پہنچی ہے۔ فوق کشمیر کا وہ جیالا سپوت تھا جس نے کشمیر میں اور کشمیر سے باہر کشمیر کی صحیح ترجمانی اپنا ایمان سمجھا اور نہایت ہی شستہ اور سلیس انداز میں کشمیر کے ماضی سے بیرون کشمیر کے لوگوں کو روشناس کرانے کے لئے قلم کا سہارا لیا اور بیسویں صدی کے اوایل میں اردو دنیا میں دھوم مچا دی۔

اس دور میں انجمن نصرۃ الاسلام، انجمن مرزاییاں اور انجمن شرعی شیعیان کی طرف سے اردو میں دینی مسایل پر کئی کتابیں لکھی گئیں۔ ان کتابوں اور رسایل کے علاوہ عیسائی مشنریوں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

نے مسیحیت اور دیگر مباحث کا احاطہ کیا۔ ان کی تفصیل ایک علیحدہ مضمون کی متقاضی ہے ۔

۱۹۲۴ء میں لالہ ملک راج صراف نے ریاست کا پہلا اخبار جموں سے جاری کیا ۔ اس اخبار کی اشاعت نے اردو نثر کی توسیع اور ترقی کے لئے راہیں کھول دیں اور نئی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقعہ فراہم کیا۔ اس طرح سے نئے نثر نگاروں کا ایک بڑا حلقہ پیدا ہوا۔ ان میں مولوی زین العابدین (مہذب کسان) سالگرام کول، جیالال کلم، مولوی عبداللہ وکیل، پریم ناتھ بزاز، کشپ بندھو، پریم ناتھ رونق، بدلیو پرشاد شرما، عشرت کشتواڑی، نشاط کشتواڑی، دیاکرشن گردش، غلام حید رچشتی، قیس شیروانی، تاراچند ترسل سالک کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں بعض لوگ لاہور کے اخبارات کے لئے بھی لکھتے تھے۔ لیکن رنبیر نے ان کی صلاحیتوں کو ابھارا اور پنپنے کا موقع فراہم کیا۔

سری نگر کا پہلا اخبار "وتستا" پریم ناتھ بزاز کی ادارت میں ۱۹۳۳ء میں شایع ہوا۔ اور اس کے بعد بزاز صاحب اور شیخ محمد عبداللہ نے ۱۹۳۵ میں ہمدرد شایع کیا ۔ "ہمدرد" ریاست کا پہلا مصور ہفت روزہ تھا۔ اسی سال کشمیری پنڈتوں کی انجمن کے پرچے "مارتنڈ" کا اجرا ہوا۔ ان اخبارات نے صحافت کا ایک نیا معیار قائم کیا اور شمالی ہندوستان کی اخباری دنیا میں دھوم مچادی۔ یہی وہ اخبار ہیں جن کے ضخیم سالنامون اور خاص نمبروں نے یہاں کے تخلیقی فنکاروں کو اردو دنیا میں متعارف کیا۔ خاص قلمکاروں میں جنہوں نے نثر کے مختلف شعبوں میں قلم چلایا۔ پردیسی، دینا ناتھ وارایکوٹ شاہد، نیاز کاہری، انور ہیرہمی، وشوا ناتھ ماہ، آنند کول بامزی، نندلال بے غرض، علامہ کشفی، تیرتھ کاشمیری، شیام لال احمد، علامہ مجہول قابل ذکر ہیں۔ ان ادیبوں نے اپنی تمام فنی بصیرت کے ساتھ ریاست کی فکری اور معاشرتی زندگی کے پہلوؤں کی ترجمانی کی۔ اس دور کی اہم تصانیف میں پریم ناتھ بزاز کی "کشمیر کا گاندھی" (شیخ محمد عبداللہ کی سوانح حیات) تیرتھ کاشمیری

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کی دیوتا (شری بھٹ کی سوانح) وشواناتھ درماہ کی "تلاش حقیقت" اور انکشاف حقیقت (فلسفۂ اخلاق) اور سرد انند چراغی اور آفتاب کول واچھو کی چند چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں۔

فکشن

ریاست میں نثر کے اس شعبے کی طرف غالباً" فوق مرحوم نے سب سے پہلے توجہ کی اور کچھ تاریخی اور نیم تاریخی قصے لکھے۔ اس کے بعد چراغ حسن حسرت کا افسانوی مجموعہ کیسے کیچھلکا اور دیگر افسانے" (۱۹۲۷ء) میں لاہور سے شائع ہوا۔ لیکن اس صنف میں باضابطہ اور باقاعدہ طور پر پریم ناتھ پردیسی نے رنگ بھر دیا۔ ان کے چراغ سے بعد کے تخلیق کاروں نے اپنا چراغ روشن کیا۔ پردیسی کی ابتدائی کہانیاں بچوں کے ماہنامے "رتن" جموں میں شائع ہوتی تھیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی دلچسپ اور نصیحت آمیز کہانیاں ہوا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں ٹیگور کے ادب لطیف اور نثری شاعری کے ترجموں نے زبان و بیان کا جادو جگایا تھا اور سدرشن، یلدرم، نیاز اور پریم چند کے افسانوں نے دھوم مچائی تھی۔ پردیسی اسی فضا میں پروان چڑھے۔ انہوں نے ابتدا شاعری سے کی لیکن ۱۹۳۲ء سے نثر کی طرف توجہ کی۔ شروع شروع میں ان کی نثر میں ٹیگور کا رومانی اسلوب اور ادب لطیف کا اثر جھلکنے لگا۔ لیکن پھر پریم چند کی "کفن" اور انگارے کے افسانوں کی اشاعت نے ان کا ذہن مکمل طور سے بدل دیا اور وہ ۱۹۳۸ء کے بعد حقیقت آمیز ادب کی تخلیق میں مصروف ہوئے اس زمانے میں ہماری تحریک آزادی نے نیا موڑ لیا تھا اور پردیسی ایک حساس فنکار کی طرح اس واضح حقیقت سے دامن بچا نہ سکے۔ انہوں نے مختلف فرضی ناموں سے بھی کہانیاں لکھیں اور اپنے فن کو جذباتیت اور رومانیت کے حسین سراب سے نکال کر زندگی کے خارزار میں پہنچا دیا اور صحیح معنوں میں اہل کشمیر کے جذبات کی ترجمانی کی جہاں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

صرف حسن ہی نہیں تھا بلکہ اس کے دبیز پردوں کے پیچھے بھوک، بیکاری اور غلامی کے رستے ہوئے ناسور تھے۔ پردیسی کے اہم کارنامے افسانوں کے مجموعے شام و سحر، دنیا ہماری، بجھتے چراغ، بچوں کے لئے چپت، کتابیں چورنگی، چار بیٹے، جان باز بچے، کرنیں اور ایک ناول "پوتی" ہے۔ پردیسی ریاست کے بڑے قد کا افسانہ نگار تھے اور ان کا شمار ملک کے صف اول کے اردو افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے وہ ہماری ریاست کے پہلے فن کار تھے جو کہانی بننے اور کہانی کہنے کا گُر جانتے تھے۔ بیان کے اختصار لہجے کی چستی اور موضوع کی صداقت پر ان کے فن کی عمارت کھڑی ہے۔ پردیسی کے معاصرین میں دوسرے بڑے افسانہ نگار پریم ناتھ در ہیں۔ وہ پردیسی سے ذرا دیر کے بعد آئے۔ در کے یہاں کشمیری زندگی کی صحیح نمائندے نظر آتی ہے۔ درؔ کے اسلوب کی خاص خصوصیت ان کی زبان کا برتاؤ ہے۔ ان کے یہاں مافی الضمیر کے اظہار کے لئے تشبیہات، استعارات اور تراکیب کی ایسی ندرت ملتی ہے۔ جہاں وہ پردیسی سے چند قدم آگے نظر آتے ہیں۔ "کاغذ کا واسدیو" اور "نیلی آنکھیں" نام کے مجموعے اردو کے افسانوی ادب میں اپنا مقام رکھتے ہیں اس دور میں کئی اور نام ابھرے نرسنگھ داس نرگسؔ جو سال ہا سال تک مولارام کوٹی کے فرضی نام سے لکھتے رہے اچھے افسانہ نگار تھے۔ ان کے کئی مجموعے مثلاً "دکھیا سنسار" "سندلیہ" وغیرہ اسی صدی کے چوتھے دہے میں شائع ہوئے۔ نرگس کے یہاں ایک نئے انداز میں جاگیردارانہ نظام کے جبر و استبداد اور طبقاتی کشمکش کی تصویر ملتی ہے۔ دوسرے افسانہ نگاروں میں مجھور، یاسین عزیز کاشی، اختر عسکری، کوثر سیمابی، موہن یاور، گلزار احمد فدا، کشمیری لال ذاکر، جگدیش کنول، کیف اسرائیلی، ٹھاکر پونچھی، عبدالعزیز علائی، غلام حیدر چستی، نند لال بے غرض، دینا ناتھ وارکو شعلہ، شیام لال احمد، گنگا دھر بٹ دیہاتی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

محمود ہاشمی، حمید نظامی کاشی ناتھ، پیہ کنول، ویریشور، تیرتھ کاشمیری وغیرہ بیسوں فن کار قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں کئی لوگوں کے مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ تقسیم کے بعد کئی ادیب پاکستان چلے گئے۔ جن میں قدرت اللہ شہاب، کیف اسرائیلی، عزیز کاشر، محمد عمر، کوثر سیمابی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد کئی اور نام اُبھرے۔ سومناتھ زتشی، علی محمد لون، اختر محی الدین، بنسی نردوش یہ لوگ پہلے اردو میں لکھتے تھے۔ تیج بہادر بھان، پُشکر ناتھ، حامدی کاشمیری، دیپک کول، برج پریمی، ہری کرشن کول، مجبور بدخشی، وید راہی، اُمیش کول، زیڈ سیمی اور دوسری نسل میں شبنم قیوم، ریاض پنجابی، عمر مجید، او، پی، شارمی، کلدیپ رعنا، کشوری منچندہ، عبد الغنی لداخی، جوتیشور پتھک، ظہور الدین، بشیر شاہ، امر مالموہی شمس الدین شمیم، محمد زمان آزردہ، ڈی کے کنول، مالک رام آنند، آنند لہر، رام کمار ابرول لیش سروج اور کئی چھوٹے بڑے نام اُبھرے ہیں۔ یہ لوگ ریاست میں اردو فکشن کی آبرو ہیں ان میں سے بعض لوگوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ فن کار نہ صرف یہ کہ کہانی کے فن سے واقف ہیں بلکہ وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر اپنے فن کو ڈھالتے رہے ہیں۔ رومانی دور ہو یا ترقی پسندی کا شعور یا عصرِ حاضر کے تقاضے ہوں ان کے یہاں بدلتے ہوئے رجحانات کی بھرپور ترجمانی نظر آتی ہے۔ اسالیب اور ہیئت کے نئے تجربوں سے ان کا فن عبارت ہے۔ جدید اردو ادب میں ان میں سے بیشتر لوگ ملکی سطح پر اپنی فن کارانہ حیثیت منوا چکے ہیں۔

ناول نگاروں میں فوق مرحوم کے بعد پہلا نام نندلال بے غرض کا ہے جنہوں نے سرشار کے اسلوب میں لکھنا شروع کیا تھا۔ ان کے ناول "تازیانہ عبرت" میں فسانۂ آزاد کا تتبع نظر آتا ہے۔ پریم ناتھ پردیسی نے بھی "لولی" نام کا ایک ناول لکھا تھا جو ۱۹۴۷ء کی افراط و تفریط میں تلف ہو گیا۔ رامانند ساگر کا ناول "اور انسان مر گیا"

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

فسادات کے موضوع پر اپنے عہد کا اہم ناول ہے جو عرصہ دراز تک برصغیر کے ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع بنا رہا۔ ساگر نے اپنے ناول کو سرینگر کی ترقی پسند مصنفین کی انجمن میں قسط وار پڑھا تھا۔ تقسیم کے بعد کشمیری لال ذاکر، ٹھاکر پونچھی، علی محمد لون، تیج بہادر بھان، نور شاہ، صوفی محی الدین، حامدی کاشمیری، غلام رسول سنتوش اور بعض دوسرے لوگوں نے اچھے ناول لکھے۔

ڈراما کی صنف میں بھی اچھا کام ہوا ہے۔ محمد عمر نور الٰہی کی کتاب ناٹک ساگر اردو کے ڈرامائی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ دینا ناتھ وار یکو کا ڈراما "رکمنی ہرن" ۱۹۳۲ء میں ہمدرد سرینگر میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد محمود ہاشمی، پردیسی لون، زتشی، پشکر، موہن یاور، وجے سوری، حامدی، آفاق، ویدراہی اور کئی دوسرے لوگوں نے اچھے ڈرامے لکھے۔ ان سب ادیبوں نے تجربے کی گہرائی اور مشاہدے کی صداقت کو بروئے کار لاکر کشمیر کی سیاسی، سماجی، فکری اور تہذیبی زندگی کے اہم پہلوؤں کی عکاسی کی۔

تحقیق و تنقید

عبدالاحد آزاد ہمارے پہلے محقق اور ناقد ہیں۔ آزاد نے ۱۹۳۵ء میں حیات مہجور کے عنوان سے ایک چھوٹا سا مقالہ لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن ان کے ذوق جستجو نے اس کام کو کافی پھیلاؤ دیا۔ حتیٰ کہ ایک کافی ضخیم مسودہ تیار کرلیا۔ یہ مقالہ ۱۹۵۹ء میں پہلی بار کلچرل اکادمی کے اہتمام سے "کشمیری زبان اور شاعری" کے عنوان سے تین جلدوں میں شائع ہوا۔ آزاد اگرچہ کم تعلیم یافتہ تھے مگر ان میں کھوج تحقیق اور تجسس کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس زمانے میں جب کشمیر میں رسل و رسائل کے موزوں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ذرائع نہیں تھے آزاد مہینوں دور دراز دیہاتوں میں گھومتے رہے اور بڑی جگر کاوی کے
بعد مواد اکٹھا کر لیا۔ "کشمیری زبان اور شاعری" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کشمیری زبان کی
شاعری سے متعلق ہے لیکن اسے اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے
آزاد نے اس موضوع پر سب سے پہلے قلم اٹھایا اور طرز نگارش کی شائستگی اور محققانہ
جگر کاوی کے ساتھ یہ کتاب مرتب کر لی۔ اس قابل قدر تصنیف میں علاوہ اور باتوں کے
مصنف کا تنقیدی شعور اور استدلالانہ انداز متاثر کرتا ہے آزاد پہلے محقق
اور ناقد ہیں جنہوں نے کشمیری شاعری کے تدریجی ارتقاء کے علاوہ تصوف اور فلسفے کے
مسائل اور روحانیت کے مباحث اٹھائے اور ان پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اگر زندگی
یاری کرتی تو آزاد اور کئی کارنامے انجام دیتے۔

نند لال طالب اردو کے بلند مقام شاعر تھے۔ لیکن تحقیق و تنقید میں
ان کا کارنامہ "جوہر آئینہ" ایک اہم کام ہے۔ طالب نے بڑے سلجھے ہوئے عالمانہ
اور غیر جذباتی انداز میں غالب پر ایک اچھا کارنامہ انجام دیا۔ غلام حیدر چشتی کی "اصلاح ادب"
اور ڈاکٹر سدھیشور ورما کی لسانیات سے متعلق تصنیف اس دور کے بہت اہم کارنامے
ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ابھرنے والے ناقدوں میں ڈاکٹر حبیب اللہ حامدی کاشمیری کا
نام سر فہرست ہے۔ حامدی شعر افسانے، ناول، ڈرامے تمام اصناف پر اپنا قلم آزما
چکے ہیں اور ان میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ لیکن ادھر چند برسوں سے انہوں نے تحقیق و
تنقید کو اپنا خاص موضوع بنایا ہے "جدید اردو نظم اور یورپی اثرات" "غالب
کے تخلیقی سرچشمے" "اردو شاعری اور عصری حسیت" "کارگہ شیشہ گری"
"غالب اور اقبال" "ناصر کاظمی کی شاعری" وغیرہ اس شعبے میں ان کے اہم کارنامے ہیں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ڈاکٹر اکبر حیدری ریاست کے ایک اور محقق ہیں۔ جنہوں نے اردو کی کلاسیکی شاعری کے کئی پہلوؤں کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان کا خاص موضوع اردو مرثیہ ہے اکبر حیدری صاحب نے ایک اچھے محقق کا فرض نبھایا ہے۔

...... ان کی تصانیف میں میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر، تحقیق و انتقاد مطالعہ زور، تحقیقی جائیزے، دیوان میر اودھ میں، مرثیہ نگاری کا ارتقاء، تحقیقی نوادر اہم ہیں۔

محمد یوسف ٹینگ کا نام محتاج تعارف نہیں۔ وہ ہمارے بالغ نظر نقاد ہیں۔ اردو اور کشمیری ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں اور بہت سے عالمانہ تنقیدی اور تحقیقی مقالے لکھ چکے ہیں۔ جو ایک نئی سوچ و فکر کا آئینہ ہیں۔ دوسرے نقادوں اور محققوں میں پروفیسر لشپے، رحمان راہی، کاشی ناتھ پنڈتا، شمس الدین احمد، شمیم احمد شمیم، امین کامل، محمد عبداللہ شیدا، غلام رسول نازکی، قیصر قلندر، مولوی محمد ابراہیم، موتی لال ساقی، بدیو پرشاد شرما، مشعل سلطانپوری، برج پریمی، رشید نازکی، نشاط انصاری، مرغوب بانہالی، محمد زمان آزردہ، ظہور الدین، عبدالغنی لدّاخی، سیف الدین سوز، عبدالاحد رفیق، پریمی رومانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان ادیبوں، نقادوں اور محققوں نے ادب تہذیب اور تمدن کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھے ہیں جو نہ صرف ان کی وسعت نظری پر دال ہیں بلکہ جن میں اسالیب کی رنگارنگی بھی نظر آتی ہے۔

صحافت

ریاست میں اردو نثر کی اشاعت و ترویج میں اخبارات اور رسائل کا رول سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۲۴ء تک ریاست میں کوئی بھی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

لوگوں نے ریاست سے باہر لاہور، دہلی، الہ آباد اور دوسرے شہروں سے اخبارات جاری کئے۔ ان اخباروں میں خاص طور پر ریاست کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل پر مضامین لکھے جاتے تھے۔ چند اخباروں کے نام یوں ہیں :-

۱، مراسلہ کشمیر لاہور ۱۸۸۰

۲، اخبار عام لاہور ۱۸۸۱

۳، خیر خواہ کشمیر لاہور ۱۸۸۲

۴، کشمیر درپن الہ آباد ۱۸۹۸

۵، صبح کشمیر لاہور —

۶، بہار کشمیر لاہور —

۷، کشمیر گزٹ لاہور —

۸، کشمیر میگزین لاہور ۱۹۰۶

ریاست سے ایک اردو اخبار نکالنے کی اولین کوشش سالک رام سالک نے ۱۸۸۰ء میں کی تھی۔ لیکن اس زمانہ میں اخبار کی بات کرنا بھی بغاوت کے مترادف سمجھا جاتا تھا اس لئے سالک واپس لاہور چلے گئے اور ۱۸۸۲ء میں "خیر خواہ کشمیر" نکالا۔ لیکن چند برسوں کے بعد مہاراجہ رنبیر سنگھ نے خود ریاست کا پہلا اخبار "بدیا بلاس" کے نام سے جاری کرنے کا حکم دیا۔ یہ اخبار ہندی اور اردو دونوں حروف میں شائع ہوتا تھا لیکن اس میں صرف سرکاری کارگذاری کی اشاعت ہوتی تھی۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے زمانہ میں ریاست سے اخبار نکالنے کی بہت کوشش ہوئی۔ ۱۹۰۴ء میں محی الدین فوقی نے بھی اس مقصد کے لئے مہاراجہ کے سامنے درخواست پیش کی تھی لیکن انہیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ آخر یہ کوشش ۱۹۲۴ء میں رنگ لائی یہ سہرا ریاست کے مشہور صحافی لالہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ملک راج آنند کے سر باندھا جا سکتا ہے اس طرح سے "رنبیر" نے جنم لیا۔ لالہ جی نے اخبار کے ساتھ ساتھ ایک پریس بھی کھولا۔ ان اقدامات سے اردو کی اشاعت کی فضا سازگار بن گئی۔ یہ اخبار ۲۶ سال تک اردو کی خدمت کرتا رہا اور اس نے بے شمار نثر نگار پیدا کئے

لالہ ملک راج صراف نے ۱۹۴۳ء میں بچوں کے ایک رسالے ماہنامہ "رتن" کا اجراء کیا یہ اقدام فعال ثابت ہوا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس رسالے نے ہندوستان گیر شہرت حاصل کی۔ یہ رسالہ شمالی ہندوستان کے بچوں کے رسالوں میں سب سے اہم مقام رکھتا ہے۔ اس نے بچوں کے ادب کا ایک نیا معیار قائم کیا۔ لاہور کے پھول کے سوائے اس کی ٹکر کا کوئی اور رسالہ (پھول ہفت روزہ تھا) اُس زمانے میں نہیں تھا۔

رنبیر کے بعد سال ہا سال تک ریاست سے کوئی اخبار جاری نہ ہو سکا لوگوں کو اس حبس میں دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس کے پیش نظر مہاراجہ ہری سنگھ کے سیاسی مشیر سر البین بنیرجی یہ کہتے ہوئے مستعفی ہوئے کہ "ریاست میں کوئی رائے عامہ نہیں۔ پریس عنقا ہے اور تعمیری تنقید کے ذریعے سے سرکار کے پاس استفادہ کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں" اور ۱۹۳۱ء کی مڈلٹن کمیشن رپورٹ میں درج کیا گیا کہ "ریاستی مسلمانوں کی بے چینی کی ایک وجہ یہ ہے کہ ریاست میں اخبار شائع نہیں ہوتے" اس دباؤ سے پریس ایکٹ میں ترمیم ہوئی۔ ۱۹۳۲ء سے باضابطہ طور پر اخبارات کا اجراء شروع ہوا اور ۱۹۴۷ء تک اخبارات کی تعداد ۴۷ تک پہنچ گئی۔ چند قابلِ ذکر اخبارات یہ ہیں دلیش، کیسری، خدمت۔ حقیقت۔ صداقت۔ نور۔ رہنما۔ جیوتی۔ نوجیون وکیل۔ خالد۔ آفتاب۔ سرینگر ٹائمز۔ آئینہ۔ اقبال۔ ہمارا استاد نوائے صبح وغیرہ سرینگر سے اور جموں سے امر۔ سویرا۔ سچ۔ کشمیر میل۔ وطن پاسبان۔ حقیقت۔ سُدرشن۔ چاند۔ افتاد۔ خورشید۔ کشمیر ٹائمز

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اسی طرح پونچھ، میرپور اور مظفرآباد سے بھی اخبارات شائع ہوئے۔ ریاست کے صحافیوں میں ملک راج آنند، مولانا محمد سعید مسعودی، کشپ بندھو۔ علامہ کشفی۔ پریم ناتھ بزاز پریم ناتھ کنہ۔ نند لال واتل۔ قیس شیروانی، نرسنگھ داس نرگس، ثناء اللہ بٹ صوفی غلام محمد، شمیم احمد شمیم۔ غلام نبی خیال، گنگا دھر بٹ دیہاتی، موتی لال مصری، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جنہوں نے ریاست میں اردو صحافت کو ایک نیا معیار عطا کیا۔

رسائل میں "پریم" اور "فردوس" جموں ذکر کے قابل ہیں۔ "پریم" نرسنگھ داس نرگس نکالتے تھے اور فردوس کی ادارت قیس شیروانی اور کشمیری لال ذاکر کے سپرد تھی۔ (فردوس میں پریم چند اور ان کی اہلیہ شیورانی دیوی کی کہانیاں بھی چھپتی تھیں) ۱۹۴۷ء کے بعد رسائل کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ محکمہ اطلاعات نے ظفر پیامی کی ادارت میں "تعمیر" نکالا۔ جموں سے ویدراہی نے "سویرا" موہن یاور نے "سنگم" اور نند گوپال باوا نے "نوری جہیم" شروع کیا۔ محکمہ دیہات سدھار کا رسالہ "دیہات سدھار" باقاعدگی سے شائع ہونے لگا۔ اس کے علاوہ کلچرل کانفرنس نے "گونگ پوش" اور "آزاد" نکالا۔ جیوتی۔ وکیل۔ ہما۔ جمبرنا۔ کینواس۔ دلیش۔ جموں پروگریسیو رائیٹرس ایسوسی ایشن کا "ادبیات" شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کا "نیا شعور" "ادبیات" اور "بازیافت" بھی قابلِ ذکر ہیں۔ مقامی کالجوں کے رسائل میں "پرتاپ" "لالہ رخ" "توی" "زون" "ہمپوش" بھی اہم ہیں۔ محکمہ تعلیم کا تعلیمی اور تدریسی مجلہ "تعلیم جدید" پیرزادہ غلام رسول اور غلام رسول نازکی نکالتے رہے۔ یہ پرچہ خواجہ غلام السیدین ناظم تعلیمات کی نگرانی میں باقاعدہ چھپتا رہا۔ مرحوم شمیم احمد شمیم نے "آئینہ" کو ایک نئی جہت عطا کی اور اسے ملک کے اردو داں طبقے میں روشناس کیا۔ ٹیچرس ایسوسی ایشن کا "استاد" [illegible] شائع کئے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اردو شعر و ادب کی اشاعت میں کلچرل اکادمی کی مساعی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے اہتمام سے چھپنے والے شیرازہ اور ہمارا ادب نے گذشتہ برسوں میں کئی نمبر شایع کئے۔ جن کی دستاویزی اہمیت ہے۔

ادبی انجمنیں

اردو نثر کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں ادبی انجمنوں کا ذکر ناگزیر ہے۔ جب اخبارات اور رسائل شایع ہونے لگے تو یہاں کے اہل قلم حضرات نے اپنے احساسات کا اظہار اردو نثر اور شعر میں کرنا شروع کیا۔ باہر کے تخلیق کاروں کا ادب یہاں پہنچا تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور جب ریاست سے باہر کے سربرآوردہ ادیبوں اور شاعروں نے یہاں آنا شروع کیا تو تیرتے ہوئے مشاعروں کا اہتمام ہوا۔ ان سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وقتاً فوقتاً کئی ادبی انجمنیں بنیں۔ ان انجمنوں کی نشستیں باقاعدگی سے وقفوں کے بعد ہوا کرتی تھیں جہاں ادبی مباحثے ہوا کرتے تھے اور شعر و نثر کی تخلیقات پڑھی جاتی تھیں۔ بعض انجمنوں نے وقتاً فوقتاً پرچے بھی نکالے اور اس طرح ادب کی اشاعت کا وسیلہ بن گئے۔ یہاں بعض انجمنوں کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

منشی سراج الدین احمد کے زمانے میں ان کے مکان پر ریاستی اور غیر ریاستی ادیبوں کے اجتماع ہوا کرتے تھے۔ جن میں علامہ کیفی، ڈاکٹر تاثیر، سر عبدالقادر، ڈاکٹر کچلو، رام بابو سکسینہ، عبدالمجید سالک، خوشی محمد ناظر، حفیظ جالندھری وغیرہ شامل ہوتے تھے۔ یہاں شعر و شاعری کے علاوہ نثری کارناموں پر بھی جلسے ہوتے تھے۔ جموں میں قیس شیروانی، اللہ رکھا ساغر، نرسنگھ داس نرگس نے کئی ادبی انجمنیں تشکیل دیں۔ کشمیر میں پردیسی مرحوم نے حلقہ ارباب ذوق منظم

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

لی۔ اس کے بعد رامانند ساگر کے اشتراک کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ شروع ہوئی۔
اس کی نشستیں پہلے پردیسی کے مکان پر اور بعد میں ایس پی کالج ہال میں ہوا کرتی تھیں۔
رامانند ساگر نے اپنا مشہور ناول "اور انسان مرگیا" قسط وار ان ہی نشستوں میں
پڑھا تھا۔ پردیسی اور پریم ناتھ در نے اپنی مشہور کہانیاں اسی دور میں لکھیں۔ ۱۹۴۴ء
۱۹۴۵ء کے آس پاس "انجمن ترقی اردو" کی تشکیل اور تنظیم ہوئی۔ اس تنظیم نے اپنی شروعات
اقبالیات سے متعلق تقاریر کے سلسلے سے کی۔ اس انجمن کے جلسوں میں ڈاکٹر تارا چند،
ڈاکٹر یوسف حسین خان، خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر ہادی حسن وغیرہ نے کئی مقالات پڑھے اور
اقبال کے فن اور فلسفے کے کئی گوشوں پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر تاثیر نے اپنے دوران قیام اردو سبھا
کو تشکیل دی۔ اس انجمن کا ایک رسالہ بھی شایع ہوتا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستانی حملے کے
دوران اندرونی دفاع کے لئے نیشنل ملیشا قائم ہوا۔ اس کے ساتھ ایک کلچرل فرنٹ بھی
منظم کیا گیا۔ اس محاذ سے وابستہ شاعروں اور ادیبوں نے عوام کا لہو گرمانے والے گیت
اور نظمیں تخلیق کیں اور ڈرامے اور کہانیاں لکھیں۔ یہ کہانیاں ڈرامے اور رپورتاژ ہمارے نثری
خزانے میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ "مجاہد شیروانی" اور "سولی" اس دور کی تخلیق ہیں۔
محمود ہاشمی کا "یہ کشمیر ہے" اس دور کا ایک قابل قدر اردو ڈرامہ ہے جو کلچرل فرنٹ کی طرف
سے اسٹیج ہوا۔ پردیسی نے ایک رپورتاژ "چودہ دن" اسی زمانے میں لکھا۔

اس عبوری دور کے بعد کلچرل فرنٹ آل سٹیٹ کلچرل کانفرنس میں تبدیل ہوا
اس میں مصنفین، مصور اور تھیٹر کے فن کار شامل تھے۔ اپنی انتہا پسندی کے باوجود
اس انجمن نے فکر و نظر کی روشنی پھیلائی اور شعر و ادب کو مالا مال کیا۔ یہ اسی انجمن
کی دین تھی کہ نثر کے مختلف شعبوں میں نہ صرف مواد کے لحاظ سے ترقی ہوئی بلکہ ہیئت
اور فارم میں بھی تبدیلی آئی اور حقیقت آمیز ادب تخلیق ہوا۔ "کونگ پوش" اور آزاد

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اسی انجمن کے ترجمان تھے۔ اس انجمن کا شیرازہ بکھرنے کے بعد کئی اور انجمنیں وجود میں آئیں جن میں حلقہ علم و ادب، لٹریری فورم، انجمن ارباب ذوق، فروغ اردو جموں، بزم ادب، بزم اقبال، ادبی کنج جموں، بزم اردو ادب جموں، انجمن ادب جموں وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

دوسرے اداروں میں ریاستی کلچرل اکادمی، ریڈیو کشمیر سرینگر اور جموں دوردرشن کیندر سرینگر، اقبال انسٹی ٹیوٹ سرینگر، کشمیر اور جموں یونیورسٹی کے اردو شعبے قابلِ ذکر ہیں۔ ان اداروں کا قیام ۱۹۴۷ء کے بعد عمل میں آیا۔ یہ ادارے بڑے خلوص کے ساتھ اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ اردو نثر کی ترقی میں ان اداروں کا عملی تعاون رہا ہے کلچرل اکادمی نے نہ صرف مذاکروں، مباحثوں اور سمیناروں کے ذریعے اردو کی اشاعت میں حصہ لیا ہے بلکہ اس کی مالی معاونت سے پچاسوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جو ایک گراں قدر اور بے مثال کارنامہ ہے۔

اور آخر میں ان نثر نگاروں، محققوں، کہانی کاروں اور ناقدوں کے کارناموں کا کیا ذکر کروں کہ اردو دنیا میں ایسا کون کور ذوق ہوگا جو ان کے کارناموں سے واقف نہ ہو۔ یہ بات ہمارے لیے باعث سعادت ہے کہ یہ قدر حضرات سال ہا سال سے ہمارے درمیان رہا کیا۔ اور ہمارا حصہ بن چکے ہیں۔ میری مراد پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر شکیل الرحمن پروفیسر جگن ناتھ آزاد، مظہر امام، منظر اعظمی وغیرہ سے ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کی نثری خدمات کو کون بھول سکتا ہے۔ انہوں نے کشمیر میں اپنے سات سال کے قیام کے دوران کشمیر اور کشمیری ادبیات پر کئی گراں قدر کتابیں لکھیں۔ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ، دو بھائی، دو ادیب، کشمیر میں اردو وغیرہ ان کی اہم کتابیں ہیں۔ ڈاکٹر نذر مرحوم اور ڈاکٹر گیان چند جین نے بھی یہاں رہ کر کشمیر سے متعلق کئی اچھے مضامین لکھے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ریاست کشمیر نے اردو نثر کے پھیلاؤ اس کی اشاعت اور توسیع اور اس کی خدمت گذاری میں جو کام کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگوں کو اس زبان کے ساتھ کتنی محبت ہے۔ اپنی علاقائی زبانوں، کشمیری، ڈوگری، لداخی کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہاں کے لوگوں نے ہمیشہ چاہا ہے کہ اس زبان کو آگے بڑھایا جائے کہ یہی ریاست میں رابطے کی زبان ہے اور اس کی مدد سے ہم ریاست کی کلچرل اکائیوں کے ثقافتی رشتے کو فروغ دے سکتے ہیں۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

جموں و کشمیر میں اردو تنقید و تحقیق

ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان کی عمر یہی کوئی سو سوا سو سال کے آس پاس ہو گی۔ مہاراجہ گلاب سنگھ (۱۸۴۶ - ۱۸۵۶ء) نے نہ صرف ڈوگرہ سلطنت کی بنیاد ڈالی بلکہ ریاست جموں وکشمیر کی حکومت قایم کی۔ اور وقت کے تقاضوں اور سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر ریاست کے تعلقات دہلی اور لاہور کی سرکاروں کے ساتھ استوار ہوئے اس زمانے میں وسایل معاش کے ساتھ ساتھ تجارتی لین دین کے سلسلے میں عام لوگوں کو بھی دور دراز جگہوں پر آنے جانے کے مواقع میسر رہتے۔ اس باہمی اختلاط سے سیلانیوں اور تاجر پیشہ لوگوں کو مروجہ اردو میں جانکاری حاصل ہوئی۔

مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں ریاست کی درباری زبان فارسی تھی۔ لیکن جموں کے بیشتر علاقوں میں ڈوگری کا بول بالا تھا۔ جو لسانی اعتبار سے پنجابی اور اردو کے قریب ہے لاہور اور پنجاب کے ساتھ اہل جموں کے تعلقات وادی کے لوگوں سے مقابلتاً زیادہ استوار تھے اس لئے کشمیر کے مقابلے میں جموں لاہور کے نزدیک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوبہ جموں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

میں اردو زبان کے نقوش کشمیر کے مقابلے میں بہت جلد مرتب ہوئے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۸۵۔۱۸۵۷ء) نے وقت کے تقاضوں کے پیش نظر نئے علوم و فنون کو رائج کرنے کیلئے اقدامات کئے۔ اسی منصوبے کا ایک حصہ بدیا بلاس پریس اور ایک دارالترجمے کا اہتمام تھا۔ "بدیا بلاس" کے نام سے ریاست کا پہلا اخبار سرکاری گزٹ کے طور پر اسی پریس سے شائع ہوا۔ دارالترجمے کے اہتمام سے علاوہ ڈوگری اور ہندی کے اردو میں بھی مختلف مسودات ترجمے ہونے لگے، ریاست میں اردو زبان کی باقاعدہ شروعات یہیں سے ہوتی ہے۔ اسی زمانے سے کشمیری ادیبوں اور شاعروں کی ادبی کاوشیں منظر عام پر آنے لگیں۔ میری مراد ان ادیبوں اور شاعروں سے ہے جنہوں نے ترک وطن نہیں کیا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ۱۸۹۰ء سے ۱۹۲۴ء تک کئی کشمیریوں نے لاہور، دلی، الہ آباد وغیرہ سے کئی اخبارات جاری کئے۔ اسمیں علاوہ دوسری باتوں کے سیاسی سماجی اور معاشرتی مسائل پر مضامین لکھے جاتے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں جموں سے ریاست کا پہلا باقاعدہ اخبار "رنبیر" اور اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں کشمیر سے "وتستا" جاری ہوا۔ ان اخباروں کے اجراء ہونے سے ریاستی ادیبوں اور شاعروں کو ایک حوصلہ ملا اور وہ شعر و نثر کے مختلف شعبوں میں قلم چلانے لگے، لیکن اس ابتدائی دور میں ریاستی قلمکاروں سے اعلیٰ درجے کے ادبی کارناموں کی توقع کرنا عبث ہے۔ خاص طور پر تحقیق اور تنقید کے میدان میں جس میں زبردست لگن و کاوش کے حوصلے کیساتھ ساتھ محققانہ آہنگ، فکر و نظر کی وسعت، اور تنقیدی شعور کی ضرورت ہے اس لئے بھی کہ اردو زبان ابھی ریاست میں گھٹنوں کے بل چلنا سیکھ رہی تھی۔/

اس بات میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ تحقیق، تنقید کی پہلی سیڑھی ہے تحقیق کی عدم موجودگی میں صحیح تنقید ناممکن ہے۔ تلاش و تحقیق کی شروعات

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

شک وشبہ سے ہوتی ہے تنقید کیا اور کیوں کے سوال اٹھاتی ہے تحقیق ان سوالوں کے جواب فراہم کرتی ہے۔ حل طلب مسائل کو حل کرنا تحقیق کا کام ہے جس کے ڈھانچے پر تنقید اپنی عمارت تعمیر کرتی ہے۔ فن پاروں کو گمنامی کی تاریکیوں سے نکال کر دریافت کرنا تحقیق کا کام ہے اور ان کے جوہر کی شناخت کرنا تنقید کا منصب ہے لیکن کشمیر میں ابھی استقدر ادبی دفینے نہیں تھے کہ جنکو گمنامی کی تاریکیوں سے نکال کر پرکھا جاتا اور نہ ہی اس منصب کو اس ابتدائی دور میں سمجھا گیا تھا۔ فکر ونظر کی گشادگی کیساتھ بعد کے برسوں میں اس کی طرف توجہ دی اور ریاست کے محققین اور ناقدین نے اپنی بساط کے مطابق بڑے کارنامے انجام دیئے۔

ریاست میں تحقیق وتنقید کے شعبے میں ابتدائی کارنامے فوق مرحوم کے نام سے وابستہ ہیں۔ فوق نے جہاں تاریخ ادب، فکشن اور شاعری کے میدانوں میں چراغ روشن کئے تو وہ تحقیق کے میدان میں بھی وہ پیچھے نہیں ہیں۔ اگرچہ ان کی تحقیق کا اصلی دائرہ تاریخ ہے لیکن انہوں نے بعض ایسے تذکرے بھی تالیف کئے تھے جنہیں اردو ادب سے متعلق تحقیق کا حق ادا کیا۔ تذکرہ اخبار نویساں، تذکرہ شعرائے لاہور، یادرفتگان ایسی کتابیں ہیں جن کا تعلق اردو ادب کے ساتھ ہے اس کے بعد چند ایک مضامین لاہور کے اخبارات یا پھر ریاست سے شائع ہونے والے اخبارات میں نظر آتے ہیں۔ جو مختصر ہیں اور جو کسی اصول یا نظریے کے پابند نظر نہیں آتے ایسے مضامین کی اہمیت نہیں ہے۔

محمد عمر اور نور الٰہی اردو دنیا میں محمد عمر نور الٰہی کے نام سے مشہور رہیں جموں خطے سے تعلق رکھنے والے ان دو ادیبوں نے مشترکہ طور پر کئی ادبی کارنامے انجام دیئے افسانوں اور ڈراموں کی تخلیق کیساتھ ساتھ انہوں نے ڈراموں کے متعلق

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کتنے قابلِ قدر کارنامے انجام دیے جن کی نوعیت تحقیقی اور تنقیدی ہے۔ ان کا سب سے بڑا تحقیقی اور تنقیدی کارنامہ "ناٹک ساگر" ہے۔ جو اردو میں ڈرامہ نگاری پر پہلی کتاب ہے ناٹک ساگر لاہور سے ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کتاب اُردو ڈرامے کی جامع تاریخ نہیں اور اس میں کئی خامیاں موجود ہیں۔ مگر اردو ڈرامے کا کوئی سنجیدہ قاری یا ناقد اس کتاب کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ۱۹۲۷ء میں محمد عمر نورالٰہی نے امانت کی "اندر سبھا" شائع کی۔ یہ ایڈیشن بھی لاہور سے شائع ہوا۔ اس ایڈیشن کی ایک خوبی یہ ہے کہ مرتبین کے حواشی اور مقدمے نے اسکی قدر و قیمت کو جانچنے کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ "اندر سبھا" کے اس ایڈیشن کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ مرتبین نے ڈرامے کو دو ایکٹوں اور کئی سینوں میں تقسیم کر کے ایک نئی صورت دی ہے مرتبین کے حواشی اور مقدمے نے اسکی قدر و قیمت کو جانچنے کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ "اندر سبھا" کے اس ایڈیشن کو اردو ڈرامے کی تحقیق اور تنقید میں ہمیشہ نمایاں مقام رہے گا۔ اور محمد عمر نورالٰہی کی اس مساعی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

تحقیق و تنقید کے شعبے میں عبدالاحد آزاد نے بڑی سنجیدگی سے قلم اٹھایا۔ آزاد نے ۱۹۳۵ء میں 'حیات مہجور' کے عنوان سے ایک مختصر سا مقالہ لکھنا شروع کیا تھا لیکن ذوق جستجو نے اس کام کو کافی پھیلا دیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کافی ضخیم مسودہ تیار ہو گیا یہ مقالہ اگرچہ ۱۹۴۷ء سے قبل لکھا گیا تھا لیکن شائع نہ ہو سکا ۱۹۵۹ء میں پہلی بار ریاستی کلچرل اکادمی کے اہتمام سے یہ مسودہ "کشمیری زبان اور شاعری" کے عنوان سے تین جلدوں میں شائع ہوا آزاد زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے لیکن انکی کھوج اور تحقیق کے جذبے کو دیکھ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک بڑے محقق تھے اور گہری تنقیدی بصیرت کے مالک تھے اس زمانہ میں جب کشمیر میں رسل و رسائل کے موزوں ذرائع بھی موجود نہ تھے، آزاد مہینوں پاپیادہ دُور دراز دیہاتوں میں گھومتے رہے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اور بڑی جگر کاوی سے اپنا مواد اکٹھا کیا۔ کشمیری زبان کے شعرا کے اس پہلے قابل قدر اور معتبر تذکرے میں لل دید سے لیکر مہجور کے عہد تک بیشتر شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اتنا ہی نہیں کہ آزاد نے صرف چند نام گنوانے پر اکتفا کیا ہو بلکہ مشہور اور معروف شعراء کا بھی ذکر کیا ہے اور انکے بارے میں مواد فراہم کر کے ان پر بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔ آزاد کی بے پایاں محنت اور لگن اور انکی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کتاب کے مقدمے میں علی جواد زیدی رقمطراز ہیں:۔

"آزاد کی نظر میں وسعت ہے انہیں تحقیق کرنے والوں کی ہمت اور صبر ہے ان کے قلم میں روانی اور سلاست ہے اور وہ ایک بڑے کام کے انجام دینے کی پوری اہلیت رکھتے ہیں کسی مشعل کے بغیر وہ تاریکیوں میں درانہ چلے جاتے ہیں۔ صدیوں کے پردے چاک کرتے ہیں اور کم از کم چھ صدیوں پر پھیلے ہوئے مواد کو تین مختصر جلدوں میں یکجا کر دیتے ہیں۔ یہ بجائے خود ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے"

"کشمیری زبان اور شاعری" جس کے لئے آزاد نے تاریخ ادبیات کشمیر کا نام تجویز کیا تھا"، کشمیری زبان کی شاعری کی تاریخ ہے لیکن اسے اردو ادب میں ایک قابل قدر محققانہ تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے۔ آزاد پہلے محقق اور ناقد ہیں جنھوں نے اردو زبان میں اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے انہوں نے تاریخی اور سماجی پس منظر سے مدد لیکر نتائج اخذ کئے ہیں اور نہ صرف اس زبان کے تدریجی ارتقا پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے بلکہ مختلف ادوار کے شعراء کے حالات بیان کرکے اپنی پوری تنقیدی بصیرت کیساتھ انکے کلام کو پرکھا ہے۔ آزاد کو محض ایک تذکرہ نویس قرار دینا حقیقت سے انحراف کرنا ہے۔ اس سے انکے کارنامے کی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کمیت گھٹ جاتی رہی ہے۔

آزاد ایک وسیع نظریئے کے حامی نظر آتے ہیں۔ خود لکھتے ہیں:

"ہر انقلاب پرانے تہذیب و تمدن کو نئے سانچے میں ڈھالتا ہے ادب بھی انسانی زندگی کیساتھ ساتھ اسکی ہر منزل پر نئے نئے روپ بدلتا ہے مگر ہر نئے ادب کو پرانے ادب کیساتھ گہرا رابطہ ہوتا ہے۔"

اس طرح آزاد ہر بدلتے ہوئے عہد کے ڈانڈے ماضی اور روایت کے ساتھ ملاتے ہیں اور یہی ان کے سائنسی نقطۂ نظر کا غماز ہے آزاد نے عملی تنقید کے چند اچھے نمونے بھی پیش کئے ہیں اور ساتھ اس پچھڑی ہوئی زبان کے قابل قدر سرمائے کو اردو قارئین تک پہنچانے کی سعی بھی کرتے ہیں۔ انکا یہ احساس قومیت کے زبردست جذبے پر استوار ہے ایک معمولی تعلیم یافتہ پرائمری سکول معلم کے تبحر علمی اور گہری نظر کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ مغربی تنقید سے واقف نہیں ہیں۔ لیکن پھر بھی گہرا تنقیدی ادراک رکھتے ہیں نفسیاتی تحلیل" ادب برائے ادب" ادب برائے حیات، اجتماعی اور ادب اور زندگی کے رشتے کی وضاحت کرتے ہیں۔ اور اپنی کتاب کے آغاز میں ان تمام انگریزی کتابوں کی فہرست مرتب کرتے ہیں جن میں کشمیری زبان پر غیر ملکی مصنفین نے قلم اٹھایا ہے۔ ابتدائی حصوں میں تحقیق کا حق ادا کیا ہے لیکن کتاب کی تیسری جلد میں آزاد نے ایک اچھا اور متوازن ناقد ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے غرض آزاد کی کتاب تحقیق اور تنقید کا قابل قدر کارنامہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

غالب شناسی کے سلسلے میں پنڈت نندلال کول طالب کی تصنیف "جوہر آئینہ" ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ طالب کشمیر کے بلند مرتبت شاعر

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بھی برس ۱ برس تک "زمانہ" کانپور، ادب لطیف، لاہور نوائے ادب، بمبئی اور دوسرے رسائل میں تنقیدی مضامین لکھتے رہے۔ غالب فہمی اور غالب شناسی سے متعلق انکے مضامین متعدد رسائل میں چھپتے رہے ہیں "کلام غالب" پر انکی تنقید غیر جذباتی انداز میں ملتی ہے۔ انکی اس تصنیف کو صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔
غالب کے معاصرین میں جموں خطے کے غلام حیدر چشتی بھی رہے ہیں چشتی صاحب نے نثر اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی تھی، وہ اپنے عہد کے بہت اچھے ادیبوں اور محققوں میں شمار ہوتے تھے "اصلاح ادب" انکا ایک اچھا تحقیقی کارنامہ ہے جس میں انہوں نے بڑی تلاش و جستجو کے بعد بڑے بڑے مشاہیر فن کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اور زبان و بیان کی صحت اور عدم صحت کے بارے میں کئی مباحث اٹھائے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر سد ھیشور ورما نے اپنی کتاب "آریائی زبانیں" میں ایک نئے زاویہ نظر سے کئی لسانی پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ آریائی زبانوں کے رشتے سے اردو کے بعض لسانی مباحث کو پہلی بار ریاست کے کسی محقق اور ماہر لسانیات نے سائنٹفک بنیادوں پر اٹھا کر ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔
آزادی کے بعد اردو تحقیق اور تنقید نے کافی منزلیں طے کر لیں ۱۹۴۷ء کے بعد دراصل ایک سائنسی عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ ادب کا تجزیہ بھی نفسیات معاشیات اور سماجیات کی طرح سائنس کی روشنی میں ہونے لگا۔ اس نئے ذہنی رویے نے اردو تنقید اور تحقیق کے زاویے بدل دیئے اور نئے معیار اور اصول مرتب ہوئے تحقیق کے کارنامے جدید نفسیات اور سماجی علوم کی مدد سے انجام پانے لگے مغربی علم و فن کے مطالعے نے تحقیقی اور اقتصادی شعور کو جلا بخشی طرز بیان اور اسالیب کی شگفتگی نے ادبی تحقیق اور تنقید کو ریاضی کے فارمولائی انداز سے نکال کر

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سلامت اور صفائی سکھائی۔ ذہن کے دریچے کھل جانے سے تعصبات ختم ہونے
لگے اور اکثر حالتوں میں فن کی بازیافت تحقیق اور تنقید کا منصب ٹھہرا۔ انفرادی اور
آزاد کارناموں کے ساتھ یونیورسٹیوں اور اکادمیوں کے توسط سے بھی اردو تحقیق اور
تنقید کو سہارا ملا۔ ریاست جموں و کشمیر قومی پیمانے پر اس بھلائی سے متاثر ہوئی
اور یہاں کے صاحب فکر و نظر اس شعبے میں اپنے کارنامے انجام دینے لگے۔
آزادی کے اور جو محقق اور ناقد ابھرے انمیں ڈاکٹر حامدی کشمیری کا نام
سرفہرست ہے اور انکی شخصیت ہمہ جہت ہے۔ انہوں نے شاعری، فسانے
ناول، تحقیق اور تنقید جیسی اصناف پر اپنا قلم آزمایا ہے لیکن ادھر چند برسوں سے
انہوں نے تحقیق اور تنقید کو اپنا خاص موضوع بنا لیا ہے۔ جدید اردو نظم اور یورپی
اثرات غالب کے تخلیقی سرچشمے کی حیثیت اور عصری اردو شاعری "کارگہہ شیشہ گری
غالب اور اقبال" "ناصر کاظمی کی شاعری" وغیرہ اس شعبے میں انکے اہم کارنامے ہیں
حامدی اپنے تخلیقی ذہن فکر و نظر کی وسعت اور مغربی ادبیات کے گہرے مطالعے
کی بدولت اردو تنقید میں اپنا ایک مقام بنا چکے ہیں چونکہ خود شاعر اور افسانہ
نگار ہیں اس لئے دونوں اصناف پر قدرت رکھتے ہیں۔ جدید اردو نظم اور یورپی
اثرات انکا پہلا تنقیدی اور تحقیقی کارنامہ ہے۔ حامدی نے بڑی عرق ریزی سے جدید
اردو نظم کے صوری اور معنوی پہلوؤں کا مطالعہ کیا ہے۔ اردو نظم پر یورپی
اثرات کی نشاندہی کر کے ایک خالص تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔
حالی اور آزاد کے عہد سے لے کر ۴۷ء تک کی نظمیہ شاعری پر محیط
یہ مطالعہ ہے۔ اس کتاب کے بیشتر حصے تحقیقی نوعیت کے ہیں جہاں انہوں نے اردو
کی قدیم میں نظم کی [illegible] اقبال کی
شاعری

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اردو شاعری اور اردو نظم کے ابتدائی نقوش کو تلاش کیا ہے۔ اسکے بعد کا حصہ تنقیدی ہے اور یوروپی اثرات کے تحت ابھرنے والے اہم شعری رجحانات کا جائزہ لیا ہے۔ "غالب کے تخلیقی سر چشمے" میں غالب کی نفسیات کا مطالعہ کیا گیا ہے اور غالب کے فکری سر چشموں کی بازیافت ہوتی ہے۔ حامدی آرٹ کی قدر و قیمت متعین کرتے وقت شاعر سے زیادہ شعری کائنات کو اہم قرار دیتے ہیں اور بقول خود اسی آئینے میں شعری شخصیت کے نفسیاتی خدو خال تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ فنکار کی نفسیاتی زندگی کے اسرار کھولتے وقت آرٹ کی فنی اور جمالیاتی قدروں کا لحاظ کرتے ہیں۔ اس کتاب میں اسی نقطہ نظر کو سامنے رکھا گیا ہے۔

"نئی حسیت اور عصری شاعری" ایک تنقیدی کارنامہ ہے۔ ادھر کئی برسوں سے جدیدیت، شاعری اور نئی شعریات کے مباحث پیدا ہوتے ہیں۔ شروع شروع میں یہ مسائل انتہائی بکھرے اور الجھے ہوئے تھے اور نئی شاعری کی آڑ میں اچھے شعری نمونوں کیساتھ ساتھ ناقص بکھر دیے، غیر شعری نمونے بھی سامنے آتے۔ جہاں اس کے خلاف ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔ وہاں بعض لوگوں نے ان چیزوں کو اس لیے قبول کیا کہ جدیدیت کی دنیا میں انہیں جاہل، کور ذوق، اور روایت پسند نہ سمجھا جائے۔ حامدی بھی جدیدیت کے میلان سے متاثر ہیں۔ لیکن اس کے پس پشت ان کے احساس اور جذبے کی دیانت ہے۔ انہوں نے محض کورانہ تقلید سے کام نہیں لیا ہے بلکہ ان مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی کتاب اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ انہوں نے بقول شمس الرحمٰن فاروقی ایک بڑے خلاء کو بھرنے کی سعی کی ہے۔ حامدی اس کتاب میں اپنی پوری تنقیدی بصیرت سے جدید اردو شاعری کی فضاء کو اچھی طرح سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسرے متعلقہ مباحث کے لیے راستہ کھول

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دیتے ہیں۔

"کارگہہ شیشہ گری" ڈاکٹر حامدی کی حالیہ تصنیف ہے اسمیں میر کا مطالعہ ایک نئے انداز سے ملتا ہے۔ اس تصنیف میں انہوں نے میر تقی میر کی شاعری میں پوشیدہ تخیلی کائنات میں حیوانی اور علامتی پیکروں کو کھوجنے اور انکی معنویت کو پرکھنے کی مستحسن کوشش کی ہے۔ ناصر کاظمی پر حامدی کی مختصر کتاب اسی سلسلے کی ایک اور کڑی ہے۔ اسمیں حامدی معروضی طور پر ناصر کاظمی کی شاعری کی لفظی تجسیم کاری کے ذریعہ سے انکی شعری شخصیت کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ شاعر کے شعری عمل اور لاشعوری عوامل پر خاص دھیان دیتے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد ابھرنے والے محققین میں ڈاکٹر اکبر حیدری بھی ہیں۔ انہوں نے اردو کی کلاسیکی شاعری پر کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ انکی سعی جمیل سے کئی قدیم نسخے سامنے آتے ہیں۔ وہ ہمارے پہلے محقق ہیں جنہوں نے مرثیہ تذکرہ اور کلاسیکی شعراء پر بطور خاص کام کیا ہے۔ حیدری صاحب کی اہم تصانیف میں میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر، میر ضمیر، دیوان میر، شاعر اعظم مرزا دبیر، اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء، تذکرہ شاعرات اردو، دیوان نامی، تحقیقی نوادر، تذکرہ میر حسن بخط میر حسن، تذکرہ ہندی بخط مصحفی، مثنوی میر حسن وغیرہ اہم ہیں۔ حیدری صاحب نے اپنے بعض مقالات میں متنازعہ فیہ مباحث اٹھائے ہیں۔ انکی بعض آراء سے اختلاف کی گنجائش ضرور ہے لیکن ان کا حوصلہ انکی ہمت اور کام کے ساتھ ان کی لگن قابل داد ہے۔

اردو کے خدمت گذاروں میں ڈاکٹر عزیز احمد قریشی کا نام بھی شامل کیا جاسکتا ہے عزیز احمد کا بنیادی موضوع دینیات رہا ہے۔ اس موضوع پر انہوں نے کئی کتابیں اردو میں لکھی ہیں لیکن شعر و ادب کے ساتھ بھی انکی دلچسپی رہی ہے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

"جدید تنقیدی زاویے"
اور "انقلابی شاعری"، اس ضمن میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ کتابیں بقول مصنف
طالب علموں کی ضرورت کے پیش نظر لکھی گئی ہیں اور ان کی بنیاد خود ان کے زمانہ
طالب علمی میں تیار کیے ہوئے نوٹ ہیں، لہٰذا ان کتابوں میں شعر و ادب کے باریک
رموز کی تلاش عبث ہے۔ پھر بھی ڈاکٹر عزیز نے خاصا مواد اکٹھا کیا ہے اور اسے
ترتیب و تنظیم اور اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

محمد یوسف ٹینگ کا نام محتاج تعارف نہیں۔ وہ ہمارے بالغ نظر نقاد ہیں۔
اردو اور کشمیری ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ غالبؔ، اقبالؔ، منٹو، کشمیری اور
اردو کے شعر و ادب سے متعلق ان کے بعض عالمانہ تحقیقی اور تنقیدی مقالے چھپ
چکے ہیں۔ مختلف کتابوں پر لکھے ہوئے ان کے مقدمے بذاتِ خود ایک مستقل عنوان
کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے نہ صرف ان کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ
ان کی تنقیدی بصیرت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ان کے شگفتہ اسلوب اور منطقی استدلال
سے ایک نئی سوچ و فکر کا احساس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد زمان آزردہ کا تحقیقی مقالہ "مرزا سلامت علی دبیرؔ: حیات اور کارنامے"
بھی چھپ کر آگیا ہے۔ یہ مقالہ ایک غیر جانبدار مطالعے پر مبنی ہے۔ اس مقالے میں
دبیرؔ کے صحیح ادبی مقام کو متعین کرنے کی ایک مستحسن کوشش ملتی ہے نہ صرف یہ کہ
اس مطالعے میں حیات دبیرؔ کے بعض ایسے گوشوں کو تلاش کیا گیا ہے جو نظروں
سے اوجھل تھے، بلکہ دبیرؔ کے غیر مطبوعہ کلام اور ان کی دوسری کاوشوں کو دریافت
کر کے ایک کارنامہ انجام دیا گیا ہے۔ اس مقالے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس
میں دبیرؔ کے اصلی اور الحاقی کلام کی نشاندہی کی گئی ہے جس سے دبیرؔ کے کلام

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کا اصل جوہر کھل جاتا ہے۔ اور ان کے صحیح مرتبے کی پہچان ہو جاتی ہے۔ زبان کے متوازن اور سنجیدہ اسلوب نے مقالے میں جان ڈالی ہے ادھر زمان نے برسوں سے سنجیدہ موضوعات کی طرف بھی متوجہ ہوئے ہیں اور ملک کے مختلف رسائل میں ان کے کئی تحقیقی اور تنقیدی مضامین چھپ چکے ہیں۔ جو موضوع کے تنوع کے اعتبار سے اہم ہیں اور ان کی فکر و بصیرت پر دال ہیں۔

راقم السطور کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کے مجموعے "حرف جستجو" کا ذکر کرنے کی اجازت دی جائے تو عرض کر دوں گا کہ ان مضامین میں راقم کے مشاہدے مطالعے اور تلاش و جستجو کی چند کیفیتیں شامل ہیں۔ جو راقم کے ذہنی مقصد کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ مضامین اردو فکشن کے بعض فن کاروں کے تخلیقی عمل اور ان کی تخلیقات کے بعض اہم پہلوؤں کے تجزیاتی مطالعے پر مبنی ہیں۔ راقم نے ان مضامین میں اور دوسرے ایسے مضامین میں جو ملک کے معتبر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اپنی بساط بھر خلوص اور ادبی دیانت کے ساتھ تحقیقی اور تجزیاتی مطالعے پیش کرنے کی حقیر سی کوشش کی ہے۔ انکی قدر و قیمت کی پرکھ راقم کے قاری ہی صحیح معنوں میں کر سکیں گے راقم کی دو(۲) اہم کتابیں زیر طبع ہیں، "سعادت حسن منٹو" پر راقم کا تحقیقی اور تنقیدی مقالہ منٹو کی حیات اور انکے کارناموں کے تجزیاتی مطالعے پر غالباً اردو میں پہلی کتاب ہے۔ کشمیر کے سب سے بڑے افسانہ نگار "پریم ناتھ پردیسی" پر لکھی ہوئی کتاب بھی اسی نوعیت کی ہے۔ ان کتابوں کی قدر و قیمت کی جانچ اہل نظر کریں گے

جموں و کشمیر میں اردو صحافت کے عنوان سے گذشتہ برسوں میں صوفی غلام محی الدین کی کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں اردو صحافت کی تاریخ بڑی عرق ریزی سے

سمیٹ لی گئی ہے۔ اسمیں ریاست میں اردو صحافت کے آغاز سے لے کر حالیہ برسوں تک اخباروں کے اجرا، انکی درجہ بندی۔ انکے احتساب انکی طاقت اور توانائی اخبارات کی فہرست ریاست اور ریاست کے باہر کے کشمیری اخبارات کی روداد شامل ہے۔ جو زبان حال سے مصنف کی تلاش و تحقیق پر دال ہے۔

دوسرے اہم نقادوں اور محققوں میں پروفیسر شپ، پروفیسر جے لال کول پروفیسر رحمان راہی، پروفیسر شمس الدین احمد ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈتا، تیم احمد شمیم مرحوم امین کامل، غلام رسول نازکی، قیصر قلندر، موتی لال ساقی، بلدیو پرشاد شرما، رشید نازکی نیلامبر دیو شرما، محمد عبداللہ شیدا، اوتار کرشن رہبر، مرغوب بانہالی امر مالمو ہی حامد اللہ وانی، روسل پونپیر، نشاط انصاری، سیف الدین سوز، مشعل سلطانپوری، شانتی سروپ نشاط، عشرت کشتواڑی، عبدالغنی شیخ لداخی، عبدالاحد رفیق وغیرہ قابل ذکر ہیں ان ادیبوں، نقادوں اور محققوں نے شعر و ادب کے مختلف پہلوؤں پر قابل قدر مضامین لکھے ہیں، جو ان کی وسعت نظری پر دال ہیں۔

نئی فسل سے تعلق رکھنے والے نوجوان بھی بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ پریمی رومانی، مجید مضمر، اقبال فہیم، یوسف سلیم، شمشاد کرالہ واری، ریاض رفاعی چند اہم نام ہیں۔ پریمی رومانی نے حال ہی میں جدید اردو شاعری، چند مطالعے کے عنوان سے اپنی کتاب شائع کی ہے نئے شعرا کا یہ معروضی مطالعہ پہلی بار کتابی صورت میں سامنے آیا ہے۔ اقبال فہیم بت شکن ہیں ان کی تحریروں میں نئے ذہن کی آگ ہے۔ جو بعض اوقات بنا چاہے بھی اپنی بات منوا لیتی ہے۔ مجید مضمر نئے اردو افسانے کے اچھے ناقد ہیں یوسف سلیم وجودیت کے فلسفیانہ افکار اردو شاعری

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

میں تلاش کرتے ہیں اور اس سلسلے میں کئی اچھے مضامین لکھے ہیں۔
ڈاکٹر ظہورالدین کا تحقیقی مقالہ "بلیسویں صدی کے اردو ادب میں انگریزی رجحانات" ایک اچھا کام ہے۔ ظہورالدین نے اپنے مقالے میں اردو کے ساتھ انگریزی ادب کے اہم رجحانات کو بڑی محنت سے تلاش کیا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے انہوں نے بڑی دیدہ وری کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے انگریزی ماخذوں سے اپنا مواد اکٹھا کیا ہے اور پھر بلیسویں صدی کے اردو ادب میں ان رجحانات کو ٹٹول ٹٹول کر دریافت کیا ہے۔ ڈاکٹر عابد پشاوری کا مقالہ اردو کے کلاسکی سرمایے میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے انشا کی نثری خدمات کا تجزیہ کیا ہے اور کئی تاریک گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ کنول کرشن بالی کی تصنیف "آزاد نظم اور اردو شاعری" اپنے موضوع کی مطابقت سے اچھی کتاب ہے۔

شعبہ اردو کشمیر یونی ورسٹی، شعبہ اردو جموں یونی ورسٹی، اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونی ورسٹی، ریاستی کلچرل اکاڈمی، ان سب اداروں نے تحقیق اور تنقید کے شعبے میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ انکا ذکر کیئے بغیر ریاست میں اردو تحقیق اور تنقید کا باب لکھا نہیں جا سکتا۔ شعبہ اردو کشمیر یونی ورسٹی کے رسائل آگہی، نیا شعور، بازیافت اقبال انسٹی ٹیوٹ کا "اقبالیات" کلچرل اکادمی کا "شیرازہ" اور "ہمارا ادب" اس میدان میں برس ہا برس سے خاصا کام کرتے رہے ہیں۔ ان رسالوں میں اعلیٰ معیار کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں جن سے ریاستی محققوں اور ناقدوں کی علمی اور ادبی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ دونوں یونی ورسٹیوں میں تحقیق اور تنقید کے شعبوں میں جو کام ہوا ہے۔ اس کو تفصیل سے بیان کرنا یہاں ممکن نہیں میں صرف چند کارناموں پر اکتفا کروں گا۔ ڈاکٹر اسداللہ کامل نے اردو میں "سیرت النبی ؐ کا ادب" پر کام کیا ہے۔ ان کا یہ تحقیقی مقالہ ہنوز

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

شائع نہیں ہو سکا ہے۔ اس مقالے میں کامل نے ایسی کتابوں کی نشاندہی کی ہے جو معراج العاشقین سے قبل اردو میں لکھی گئی ہیں اور جنکا موضوع سیرت ہے۔ کامل صاحب کا مقالہ اس لئے بھی اہم ہے کہ اسمیں سیرت نبوی سے متعلق تقریباً دو ہزار کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے جنھیں اعلیٰ درجے کی کتابوں کا ادبی مقام متعین کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد ملک کا تحقیقی مقالہ "اردو رسم خط۔ ارتقا اور جائزہ" ہے۔ ڈاکٹر سدیشور ورما کی لسانیاتی موضوع پر لکھی ہوئی اہم کتاب کے بعد ہمارے یہاں پہلی بار لسانیات کے موضوع پر کام ہوا ہے۔ مقالے میں کئی مسودات کے عکس تحریر شامل ہیں جنھیں خاص طور پر دکھنی مخطوطات (مثلاً دیوان قلی قطب شاہ) اور شمالی ہندوستان کے مخطوطات مثلاً بکٹ کہانی) کے بعض عکس اہم ہیں۔ ڈاکٹر محبوبہ وانی نے "اردو اور کشمیری شاعری میں رومانی رجحانات پر" مقالہ لکھا ہے اور بڑی محنت سے اردو شاعری کے رومانی رجحانات کے اثرات کو کشمیری ادب میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس طرح سے یہ مقالہ دونوں زبانوں کے رشتے کی بازیافت پر ایک اچھی سعی ہے شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے دوسرے اہم تحقیقی اور تنقیدی مقالوں میں ڈاکٹر طاہرہ عبداللہ کا آغا حشر کی ڈراما نگاری، ڈاکٹر شاہدہ پال کا اردو ناول میں کردار نگاری، ڈاکٹر سبحان کوثر کا اردو تنقید میں غالب شناسی ڈاکٹر نذیر احمد بٹ کا اردو تنقید میں اقبال شناسی ڈاکٹر شفیقہ پروین کا اردو شاعری میں میر کی روایت، ڈاکٹر سوہن لال کول کا انیسویں صدی کی اردو نثر میں سماجی طنز شامل ہیں۔ شعبہ اردو جموں یونیورسٹی کے زیر اہتمام بھی کئی اہم مقالے لکھے گئے ہیں جن میں ڈاکٹر منظر اعظمی کا اردو میں تمثیل نگاری، ڈاکٹر تہمینہ انجم کا "اردو ادب میں گاندھیائی اثرات۔ سردار کرتار سنگھ کا "بیدی کا فن" اسداللہ وانی کا، جموں کشمیر میں اردو افسانہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

۱۹۴۷ء کے بعد "محمد شریف ملک کا "ٹھاکر پونچھی حیات اور کارنامے" اور رام رتن چاڈگ کا "شیکھر ناتھ حیات اور فن" اچھے کارنامے ہیں۔ دونوں شعبوں میں اس وقت کئی اہم تنقیدی اور تحقیقی کارنامے انجام دیئے جا رہے ہیں۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر آل احمد سرور کی بصیرت افروز رہنمائی میں قابل قدر تحقیقی اور تنقیدی کام ہو رہا ہے۔ گذشتہ برسوں میں انسٹی ٹیوٹ کے جریدے "اقبالیات" کے کئی شمارے منظر عام پر آئے ہیں۔ اسی طرح "اقبال اور مغرب" "اقبال اور تصوف" "اقبال اور مغربی فکر" جیسی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں اقبال کے فکر و فن سے متعلق بڑے عالمانہ مقالے شائع ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ کئی اہم موضوعات پر اس وقت تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں۔

اردو تحقیق اور تنقید کی ترویج و اشاعت میں ریاستی کلچرل اکادمی کی مساعی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ گذشتہ برسوں میں اکادمی کی طرف سے اس سلسلے میں کافی کام ہوا ہے۔ اکادمی کے زیر اہتمام جو کتابیں تصنیف، تالیف یا ترجمہ ہوئی ہیں۔ انہیں جدید ڈوگری ادب کا ارتقاء (نیلامبر دیو شرما) ڈوگری لوک گیت اور پہاڑی آرٹ (نیلامبر دیو شرما) نکات و تعقات غالب ڈاکٹر علی خان (دیوان میر) ڈاکٹر حیدری (تفسیر غالب) ڈاکٹر گیان چند جین (انتی حسیت اور عصری اردو شاعری (حامدی کاشمیری) اور کئی دوسری کتابیں قابل ذکر ہیں اکادمی کے زیر اہتمام شائع ہونے والے اردو رسائل "شیرازہ" اور "ہمارا ادب" ہمارے ملک میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان رسائل میں ریاست کے محققوں اور ناقدوں کے علاوہ ملک کے چوٹی کے عالموں کے اعلیٰ پایہ کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ان میں عبدالقادر سروری، احتشام حسین، اسلوب احمد انصاری، اکبر علی خان، ڈاکٹر شکیل الرحمن، اختر انصاری، امتیاز علی عرشی، شمیم شوکت اعظمی، خلیق انجم، ڈاکٹر رضی الدین احمد ... لاہوتی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سید جعفر، شمیم حنفی، علی جواد زیدی، علی عباس حسینی نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر عابد حسین، عالم خوندمیری، عنوان چشتی، قاضی عبدالودود، قمر رئیس، گوپی چند نارنگ، گیان چند جین، محی الدین قادری زور، عتیق صدیقی، میکش اکبرآبادی، نورالسعید اختر، دیریندر پرشاد سکسینہ

سلنس راج رہبر، اطہر پرویز وغیرہ قابل ذکر ہیں، ان رسالوں کے کئی خاص نمبر بھی شائع ہوئے ہیں جو اس لئے اہم ہیں کہ انہیں تحقیق و تنقید کا حق ادا کیا گیا ہے

آخر میں ان محققوں اور نقادوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ جو اگرچہ سرزمین جموں وکشمیر سے تعلق نہیں رکھتے۔ مگر یہ حضرت اردو ادب کی آبرو ہیں۔ اردو دنیا میں کون ایسا کور ذوق ہوگا۔ جو ان کے کارناموں سے واقف نہ ہو۔ یہ بات ہمارے لئے باعث افتخار ہے کہ یہ مقتدر حضرات برس ہا برس سے ہمارے درمیان موجود ہیں اور ہمارا حصہ بن گئے ہیں یہیں رہ کر انہوں نے کئی کارنامے انجام دیتے ہیں جنکی اردو تنقید و تحقیق میں دستاویزی حیثیت ہے میری مراد پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی

اثر لکھنوی، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر شکیل الرحمان، پروفیسر جگن ناتھ آزاد ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر محمد حسن، پروفیسر مسعود حسین خان، پروفیسر عالم خوندمیری وغیرہ سے ہے

پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کی خدمات کو کون بھول سکتا ہے۔ تحقیق کے ساتھ انکی لگن جنون کی حد تک تھی۔ انہوں نے کشمیر کے اپنے سات سالہ قیام کی تاریخ ادب فارسی، پہلی کتاب ہے "دو بھائی دو ادیب" ہیں۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد کے دو اہم ادیبوں اور شاعروں کے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

حالاتِ زندگی اور ان کے کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے ۔ تاریخ ادبیات کشمیر" (تین جلدوں) میں ایک معرکے کا کارنامہ ہے جس کے ابھی تک صرف دو حصے "کشمیر میں اردو" کے عنوان سے کلچرل اکادمی کی طرف سے شایع ہوئے ہیں پوری کتاب اردو اور کشمیر کے تعلق سے دستاویزی اہمیت کی حامل ہے ۔

پروفیسر آلِ احمد سرور اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں ۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ ان کے دم قدم سے ہے ۔ گزشتہ چند برسوں میں سرور صاحب کی نگرانی میں کئی سمینار ہوئے ۔ جہاں بڑے عالمانہ تحقیقی اور تنقیدی مقالے پڑھے گئے ۔ یہ مقالے ریاست اور ملک بھر کے ماہرین اقبالیات کے غور و فکر اور تلاش و تحقیق کا نتیجہ ہیں اور ان میں سے بیشتر مقالے ایسے ہیں ۔ جو اقبال کے فکر و فن کے مختلف گوشوں پر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام شایع ہونے والے جرائد اور کتابوں میں ان کی اشاعت کا اہتمام ہوا ہے ۔ اس کے علاوہ اقبالیات کے متنوع پہلوؤں پر اس ادارے میں قابل قدر تحقیقی کام ہو رہا ہے ۔

پروفیسر شکیل الرحمان نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ کشمیر کو دیا ہے ۔ یہ سارا زمانہ انہوں نے اردو کی خدمت گزاری میں صرف کیا ہے ۔ شکیل صاحب کا شعور اسی سرزمین میں نکھرا اور یہیں ان کے تنقیدی نظریات کی تشکیل ہوئی ۔ اس دوران ان کی کئی اہم کتابیں شایع ہوئی ہیں ۔ جو تنقید و تحقیق کے شعبے سے تعلق رکھتی ہیں ۔ شکیل صاحب بنیادی طور پر ایک ناقد ہیں وہ جمالیات کی روشنی میں فن اور فنکار کا تجزیہ کرتے ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نفسیات اور اساطیر کو بھی بنیادی اہمیت دیتے ہیں ۔ اور اس طرح سے وہ تخلیق کے باطن میں چھپے ہوئے بے چین شعلے کی شناخت اور بازیافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ ڈاکٹر شکیل الرحمان، فرائیڈ، یونگ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ڈاکٹر ارک فروم اور کئی دوسرے مغربی فلسفیوں اور ماہرین نفسیات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جمالیات اور خاص طور پر ہندوستانی جمالیات کی روشنی سے بھی فیض حاصل کرتے ہیں۔ جمالیات ان کا محبوب موضوع ہے اور اس کی بصیرت سے وہ تنقید میں بھی کام لیتے ہیں۔ اردو کے جدید نقادوں میں وہ اپنے نظریئے کے باعث منفرد مقام رکھتے ہیں۔ کشمیر میں قیام کے دوران انہوں نے اردو ادبی تنقید کو ادبی قدریں اور نفسیات، غالب کی جمالیات لاوے کا سمندر، اقبال، روشنی کی جمالیات اقبال اور فنون لطیفہ، شعور اور تنقیدی شعور، دست فکر شکیل بدایونی کی رومانی شاعری فیض احمد فیض کی شاعری جیسی کتابیں دی ہیں۔ یہ کتابیں موضوع کی ندرت، فکر و نظر کی وسعت اعلیٰ تنقیدی بصیرت اور اپنے اسلوب کی انفرادیت کے باعث کافی اہم ہیں۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا پہلا عشق اقبال ہے۔ ریاست میں اپنے قیام کے دوران انہوں نے اقبال اور کشمیر، اقبال اور مغربی مفکرین، نشان منزل جیسی کتابیں لکھیں، آزاد صاحب ایک صاحب نظر محقق اور ناقد ہیں۔ انہوں نے "اقبال" کے کئی ایسے پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ جو گوشہ تاریکی میں پڑے ہوئے تھے ڈاکٹر عابد پشاوری کی نئی تصنیف "انشاء حریف و حلیف" ہمارے کلاسیکی ادبیات کے مطالعے میں اضافہ ہے۔

بڑی ناانصافی ہوگی، اگر میں دوسرے غیر ریاستی نقادوں اور محققوں کا ذکر نہ کروں، یہ حضرات اگرچہ ابھی بہت قلیل عرصے سے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ لیکن انہوں نے بھی اس دوران اپنے کئی قیمتی مقالات سے ہماری تحقیق اور تنقید کے سرمائے میں اضافہ کیا ہے۔ میرا اشارہ مظہر امام، ڈاکٹر جعفر رضا، ڈاکٹر کبیر احمد جائسی، ڈاکٹر قدوس جاوید وغیرہ سے ہے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تنقید اور تحقیق کے اس نسبتاً کم سن شعبے میں ہمارے کارنامے قلیل سہی۔ مگر اُردو ادبیات کا کوئی بھی سنجیدہ قاری ان کے متنوع موضوعات اور ان کے اعلیٰ معیار کے پیشِ نظر ان کو صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔

●●

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

منٹو اور کشمیر

تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف سیاسی حالات کے پیشِ نظر کشمیر کی آبادی کا ایک حصّہ کشمیر سے ہجرت کرکے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہوا۔ اور اپنی خداداد قابلیت کے باعث اپنے لئے بلند مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ ان ہجرت کرنے والے خاندانوں میں کئی ایسے لوگ پیدا ہوئے۔ جنہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ ان میں سے بعض ایسے مشاہیر کے نام ملتے ہیں جن کی تخلیقات نے اردو شعر و ادب کے دامن کو مالا مال کر دیا۔ ان میں سے اقبالؔ، چکبستؔ، سرشارؔ، دیا شنکر نسیمؔ، مومنؔ، آزردہ، تربھون ناتھ ہجرؔ، علامہ کیفیؔ، آغا حشرؔ، رامانند ساگرؔ، قدرت اللہ شہاب اور دوسرے لوگ قابلِ ذکر ہیں۔ اسی فہرس میں سعادت حسن منٹو کا نام ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ انہوں نے اردو کے افسانوی ادب میں اپنے تخلیقی شعور کی مدد سے گراں بہا اضافے کئے اور اردو افسانے کو موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے نئی وسعتوں سے ہمکنار کیا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

منٹو کشمیری الاصل تھے۔ ان کے بزرگ علامہ اقبال کی طرح کشمیری پنڈت تھے وہ برہمنوں کی سارسوت شاخ سے تعلق رکھتے تھے اور کشمیر سے ہجرت کرکے پنجاب میں بس گئے تھے اس کی تصدیق خود منٹو اور ان کے دوستوں نے کی ہے۔ منٹو اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں :۔

"میں کشمیری ہوں۔ بہت عرصہ ہوا، ہمارے آباؤ اجداد کشمیر سے ہجرت کرکے پنجاب آئے اور مسلمان ہو گئے۔"

کرشن چندر نے منٹو کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اپنے کتابچہ "سعادت حسن منٹو" میں انہوں نے منٹو کو کشمیری ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وقت گذرنے کے باوجود منٹو کا مزاج کشمیری ہی رہا ہے اور اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی ہے لکھتے ہیں :۔

"مزاج، جسم اور روح کے اعتبار سے منٹو آج بھی کشمیری پنڈت ہے۔"

منٹو کو اپنے کشمیری ہونے پر بڑا ناز تھا۔ وہ کشمیر اور کشمیریوں سے بڑی محبت کرتے تھے۔ اُن کی اکثر تحریروں میں اس جذبے کا پَرتو ملتا ہے۔ وہ کشمیر کا ذکر کرنے سے کبھی نہیں کتراتے تھے۔ حتیٰ کہ اپنے آپ کو "ہاتو" کہلانا بھی پسند کرتے تھے۔ خود لکھتے ہیں :۔

"میں ایک کشمیری ہوں ــــ ایک ہاتو"

اپنی کتاب لاؤڈ اسپیکر میں اعتراف کرتے ہیں :۔

"میں بھی کشمیری ہوں۔ مجھے کشمیریوں سے بہت

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

محبت ہے لیکن میں ایسے کشمیریوں سے نفرت
کرتا ہوں جو اپنی بیویوں سے بُرا سلوک کریں۔"

اُن کے ایک دوست محمد اسد اللہ نے اپنی کتاب "منٹو ۔۔ میرا دوست"
میں تفصیل سے لکھا ہے کہ وہ کشمیر سے والہانہ عشق کرتے تھے اور اس کا بار بار ذکر کرتے
تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :۔

'اگر کبھی کوئی امرتسری یا کشمیری اُن
کی طرف آنکلتا تو اس سے بڑے بے تکلف ہو
جاتے۔ بار بار اس کو بتلاتے تھے کہ میں بھی
کشمیری ہوں' ویسے امرتسری ہوں۔ عالم یہ
ہوتا تھا کہ بار بار ناک صاف کر رہے ہیں۔
سگریٹ پر سگریٹ جلا رہے ہیں۔ اُٹھ اُٹھ
کر اندر جا کر ایک پیگ چڑھا رہے ہیں۔ اور
امرتسر اور کشمیر کی باتیں کر رہے ہیں۔"

اُن کے لنگوٹیے یار ابو سعید قریشی نے بھی اپنی کتاب "منٹو" میں منٹو کی کشمیر سے محبت
کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

'اُسے اپنے کشمیری ہونے پر بڑا ناز تھا۔"

منٹو کی کئی پُشتیں امرتسر میں رہتی آئی تھیں۔ لہذا امرتسر کی گلی گلی سے وہ واقف تھے
اور امرتسر کے ذکر سے اُن پر والہانہ کیفیت طاری ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود کشمیر
ان کی دوسری کمزوری تھی۔ منٹو نے کشمیر سے یہ محبت وراثت میں پائی تھی۔ ان کے
والد مولوی غلام حسن بھی کشمیریوں سے بڑی محبت کرتے تھے وہ ہمیشہ کشمیری وضع کی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پگڑی پہنتے تھے اور اُن کا مزاج کشمیریوں سے ملتا جلتا تھا۔ وہ کشمیریوں سے اس طرح ملتے تھے جیسے وہ اُن کے جسم کا ایک انگ ہوں۔ اپنے والدِ بزرگوار کے کشمیریوں سے عشق کا ذکر منٹو نے اپنے ایک مضمون شاعرِ کشمیر مہجور میں یوں کیا ہے :-

"میرے والد صاحب کو کشمیریوں سے عشق تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ کبھی کبھی اس عشق کے زیرِ اثر کسی ہاتو یعنی مزدور کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے آیا کرتے تھے اور اُسے بیٹھک میں بٹھا کر بڑے فخر سے کہا کرتے تھے —— میں بھی کاشر ہوں۔"

منٹو کو اکثر منڈو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن ایسا کہنا غلط ہے۔ منٹو اُن کے خاندانی نام "منٹ" سے ماخوذ ہے۔ جو کشمیر میں ۱½ سیر کے بٹے کے طور پر استعمال ہوتا آیا ہے۔ یہ نام اب بگڑتے بگڑتے منٹو ہو گیا ہے۔ منٹو نے اپنی ذات کے بارے میں خود لکھا ہے :-

"کشمیر کی وادیوں میں بہت سی ذاتیں ہوتی ہیں جن کو "آل" کہتے ہیں۔ جیسے نہرو، سپرو، کچلو، وغیرہ وغیرہ، منٹ کشمیری زبان میں تولنے والے بٹے کو کہتے ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد اتنے امیر تھے کہ اپنا سونا چاندی بٹوں میں تول تول کر رکھتے تھے —"

یہاں اس بات سے بحث نہیں کہ منٹو نے اپنی ذات کے بارے میں جو کلیہ پیش کیا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔ البتہ یہ بات واضح کرنا لازمی ہے کہ منٹو ذات کے لوگ اس وقت بھی کشمیر میں ملتے ہیں اور اُن کا پیشہ اکثر حالتوں میں تجارت ہے اور ان کی ذات "منٹ" یعنی ۱½ سیر کے ساتھ کسی نہ کسی طرح وابستہ ہے۔" منڈو اور منٹو" اصلی [illegible] کشمیری پنڈتوں کی ذاتیں ہیں۔ فوق کا خیال ہے کہ جن لوگوں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

نے آگے چل کر اسلام قبول کر لیا وہ منٹو کہلائے اور جو ہندو رہے وہ "من وٹی" کے نام سے مشہور ہوئے۔

منٹو خاندان کے ایک بزرگ خواجہ رحمت اللہ تھے۔ جن کا پیشہ سوداگری تھا۔ وہ اس خاندان کے پہلے بزرگ تھے جو پنجاب کے دارالسلطنت لاہور میں آکر مقیم ہو گئے۔ ان کے پوتے خواجہ جمال الدین سکھوں کے عہدِ حکومت میں امرتسر چلے گئے اور پشمینہ سازی کے کام کو فروغ دیا۔ اور اسے صرف لاہور تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ امرتسر اور بمبئی تک پھیلا دیا۔ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے مولوی غلام حسن تھے جو بعد میں سب جج ہوئے۔ مولوی غلام حسن کے بارہ بچوں میں سے ایک سعادت حسن منٹو تھے۔ لاہور اور امرتسر میں رہائش کے باوجود منٹو خاندان کے طرزِ حیات میں کافی عرصے تک کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ حتیٰ کہ اس خاندان کے افراد کے نام بھی خالص کشمیری رہے۔ مثلاً حمزہ بٹو، رسول بٹو، احمد بٹو، تاج مالی، زون مالی وغیرہ یہ نام آج بھی ہمارے یہاں ملتے ہیں۔

منٹو کی شادی بھی ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس میں ان کی ذاتی دلچسپی کے ساتھ ساتھ ان کی والدہ کی مرضی کا زبردست ہاتھ تھا۔ اُن کی بیوی (محترمہ صفیہ منٹو) جن کا انتقال ابھی حال ہی میں ہوا افریقہ کے مشہور قومی کارکن خواجہ شمس الدین کی بھتیجی تھیں۔ اُن کے تایا افریقہ کی پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ اور جب منٹو کے ساتھ رشتے کی بات چیت ہو رہی تھی تو وہ افریقہ سے منٹو کو دیکھنے کے لئے بمبئی آئے صفیہ بیگم کے والد کا خاندان سال ہا سال سے افریقہ میں رہائش پذیر تھا۔ وہاں منٹو کے دو بڑے بھائی بھی بیرسٹری کرتے رہے تھے۔ لہٰذا ان کو رشتہ پسند آیا۔ دوسری بات تھی کہ خود کشمیری الاصل ہونے کی بنا پر ان کا رشتہ کشمیری

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کشمیری خاندان میں کرنا چاہتے تھے۔ صفیہ بیگم کے والد افریقہ میں پولیس انسپکٹر تھے۔
لیکن وہیں کسی حبشی نے انہیں بلوے میں قتل کر دیا تھا۔ اب اُن کے چچا ہی اُن کی
پرورش کرتے تھے۔ منٹو نے اپنی زندگی کی پوری تصویر ان کے سامنے رکھ دی لیکن
یہ جان کر منٹو کو خود بھی تعجب ہوا کہ وہ اس رشتے پر فوراً رضامند ہو گئے۔

منٹو نے شادی سے پہلے اپنی بیوی کو نہیں دیکھا تھا۔ ان کی ماں نے انہیں
بتایا تھا کہ لڑکی بڑی ہوشیار اور سلیقہ مند ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ
کشمیری ہے۔ منٹو اس سے بہت خوش ہوئے۔ انہیں جو کچھ معلوم ہوا، اس کی تفصیل
مزے لے کر اپنے دوست احمد ندیم قاسمی کو اپنے خط میں یوں لکھتے ہیں :-

"میری شادی مکمل طور نہیں ہوئی ہے۔ میں صرف "نکاحیا"
گیا ہوں۔ میری بیوی لاہور کے ایک کشمیری خاندان سے تعلق
رکھتی ہے۔ اس کا باپ مر چکا ہے۔ میرا باپ بھی زندہ نہیں،
وہ چشمہ لگاتی ہے۔ میں بھی چشمہ لگاتا ہوں۔ وہ ۱۱ مئی کو
پیدا ہوئی۔ میں بھی ۱۱ مئی کو پیدا ہوا تھا۔ اس کی ماں چشمہ
لگاتی ہے، میری والدہ بھی چشمہ لگاتی ہے۔ اس کے نام کا
پہلا حرف S ہے۔ میرے نام کا پہلا حرف بھی S ہے..."

منٹو کو زندگی بھر افسوس رہا کہ اُنہوں نے کبھی اپنی کھُلی آنکھوں سے کشمیر
کو نہیں دیکھا۔ وہ صرف بٹوٹ تک اس زمانے میں آئے تھے جب انہیں دق کا
مریض قرار دے کر علی گڑھ یونی ورسٹی سے نکال دیا گیا تھا۔ یہاں وہ صرف تین
ماہ رہے لیکن صحت پھر بھی سنبھل نہ سکی۔ یہیں اُن کا پہلا عشق پروان چڑھا
جس نے ان کے دل ... کی کہانیاں ان کے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سے افسانوں میں صاف طور پر نظر آتی ہیں۔ "ایک خط" "بیگو" "مصری کی ڈلی" "لالٹین" وغیرہ اس ضمن میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ منٹو کو اس بات کا بھی افسوس تھا کہ وہ کشمیری زبان سمجھ اور بول نہیں سکتے تھے۔ مہجور کی شاعری کے جو تراجم انہوں نے پڑھے تھے۔ اس سے وہ مہجور کے پرستار بن چکے تھے۔ خاص طور پر جب انہیں اس بات کا علم ہوا کہ مہجور نے ظلم وستم سہہ کر بھی اُن کے والدین کی طرح ترکِ وطن نہیں کیا تھا تو اُن کے دل میں مہجور کی توقیر اور بھی بڑھ گئی تھی۔ مہجور کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"مجھے ندامت ہے کہ میرے آباؤ اجداد نے ہجرت کی جو دو ستم سہنا بڑی بات ہے لیکن ہجرت بہت بڑا فرار ہے۔ مہجور نے ظلم وستم سہے۔ اُس نے سب سے بڑی اذیت جو ذہنی خصوصیت ہے، برداشت کی، مگر وہ ڈٹا رہا۔ ہجرت کا خیال تک بھی اس کے دماغ میں نہ آیا ۔۔۔۔۔ مہجور کے کلام کا ترجمہ پڑھنے کے بعد میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُس کا ہجر ہی اُس کا وصال ہے ۔۔۔۔"

منٹو ہند و پاک کشیدگی سے ناخوش تھے۔ انہیں اس بات سے بے حد قلق تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے سربراہ دونوں کشمیری ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے دشمن کیوں بنے ہوئے ہیں۔

اُن کا خیال تھا کہ اگر مہجور زندہ ہوتے تو حالت کچھ اور ہوتی (حالانکہ ۴۸ء کی کشیدگی کے وقت مہجور زندہ تھے)۔ اپنے شاعرانہ اور جذباتی نقطۂ نگاہ کو انہوں نے اپنے مضمون "شاعرِ کشمیر – مہجور کشمیری" میں یوں بیان کیا ہے:-

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

"اگر وہ زندہ ہوتا تو میں سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر گراہم کی ضرورت پیش نہ آتی۔ وہ اپنے قلندرانہ انداز میں جواہر لال نہرو اور خواجہ ناظم الدین کو (یہ بھی کشمیری ہیں) سمجھا دیتا کہ دیکھو انسان کا خون پانی سے ارزاں نہیں ہے کشمیری خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو، ہر حالت میں کشمیری ہے۔ تم جواہر لال نہرو ہو — یہ ناظم الدین ہے دونوں کشمیری ہو...... تم گوگجی اور بت (شلغم اور چاول) کے ایسے دستر خوان سے کبھی نکال نہیں سکتے ہو۔ پھر تم کیوں لڑتے ہو! شلغم اور بھات کی قسم کھاؤ۔ کیا تم ایک دوسرے کے گریبان میں ہاتھ ڈال سکتے ہو۔"

منٹو کی اکثر تحریروں میں کشمیر اور کشمیریوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان کی بعض کہانیاں کشمیر اور کشمیر کی زندگی کے بعض پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہندوستان و پاکستان کے متنازعے پران کی کہانیاں "آخری سلیوٹ" "ٹیٹوال کا کتا" وغیرہ اہم مقام رکھتی ہیں ان کہانیوں میں منٹو کی انسان دوستی سے دھڑکتی ہوئی روح صاف نظر آتی ہے جہاں مذہب، رنگ اور نسل کا کوئی بھید و بھاؤ نہیں ملتا۔ اسی طرح اُن کی بہت سی کہانیوں کا پس منظر کشمیر ہے۔ اور اُن کے کردار کشمیری ہیں جن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیران کی سب سے بڑی کمزوری تھی ●●

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

آرل سٹائین کے خطوط رام چند بالی کے نام

کلہن اور اس کی راج ترنگنی کا ذکر جب بھی ہوتا ہے تو سر آرل سٹائین کا نام فوراً ذہن میں آتا ہے۔ اس لئے کہ کلہن کو سمجھانے میں جس قدر حصہ اس غیر ملکی نے ادا کیا وہ بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔ راج ترنگنی کے ترجمے کے ساتھ اس کی تاویل اور اس کے گراں قدر حواشی اس شخص کے تبحر علم، کام کی لگن، محنت اور ذہانت کا زندہ ثبوت ہیں۔ سر آرل سٹائین نے اپنی زندگی کی کئی قیمتی گرمیاں کشمیر میں گذاریں اور اپنے گراں بہا کارنامے انجام دئے۔ ان کارناموں کی تکمیل میں کئی کشمیریوں کا ہاتھ رہا ہے۔ آرل سٹائین علم ادب، ثقافت، تاریخ، آثار قدیمہ اور ایسے ہی دوسرے علوم کا سچا عاشق تھا۔ ۲۵ سال تک محکمہ آثار قدیمہ کے ساتھ وابستہ رہنے کے دوران انھوں نے علاوہ دوسرے کاموں کے کشمیر اور کشمیر سے متعلق کئی کارنامے انجام دیئے اور ان کارناموں کی تکمیل کے دوران انہوں نے مقامی عالموں اور فاضلوں سے استفادہ کیا۔ ان میں خاص طور پہ پنڈت گووند کول شاستری اور پنڈت نیتانند شاستری جیسے سربرآوردہ عالم تھے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اس کا اعتراف آرل شائین بار بار کرتے ہیں۔ راج ترنگنی کے دیباچے اور "حاتم کی کہانیاں"
کے مقدمے میں پنڈت گوبند کول شاستری کی وہ جو تعریف کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ
ہوتا ہے کہ شائین اپنے مددگاروں کے تئیں کس طرح کے جذبات رکھتے تھے مددگاروں کی
ایسی لمبی فہرست میں جو ہر برس لاہور میں ان کے ساتھ رہے ایک غیر معروف نوجوان پنڈت رام
چند۔ بالی بھی تھا جو برسوں تک لاہور میں بنک میں ایک معمولی عہدے پر فائز تھا۔

رام چند بالی ۱۸۸۹ء میں پنڈت راجہ رام بلی نام کے ایک کشمیری پنڈت کے یہاں
پیدا ہوئے تھے۔ روش زمانہ کے مطابق ابتداء میں فارسی، اردو اور سنسکرت زبانوں
کی درسیات حاصل کیں اس کے بعد انگریزی تعلیم پائی۔ بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد
تلاش معاش میں سرگرداں رہے۔ کچھ عرصہ محکمہ صنعت و حرفت میں کام کیا۔ زندگی کا
بیشتر حصہ" سر آرل شائین کی ملازمت میں گذارہ۔ آخیر میں سٹیشنری اور سپلائی کے
سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر ریٹائر ہوئے۔ وہ والے ایم سی اے کی تربیت پانے والے
پہلے کشمیریوں میں تھے۔ انہوں نے یہ تربیت لاہور میں پائی تھی۔ اور "پٹ مین سسٹم"
میں کافی مہارت حاصل کی تھی۔ آرل سٹین کو اپنے کارناموں کی تکمیل کے لئے ایک
نوجوان ٹائپسٹ اور کلرک کی ضرورت تھی۔ اس لئے ایک انٹرویو کا اہتمام کیا گیا جس میں
کئی ذہین کشمیریوں نے حصہ لیا۔ لیکن قرعہ فال رام چند بالی پر پڑا اور وہ
آرل سٹائین کی ملازمت میں چالیس روپے ماہوار پر داخل ہوئے۔ بالی نے چند برسوں
میں ہی آرل سٹائین کا دل جیت لیا اور وہ ان کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے

ان کی زبردست اور قابل اعتماد خدمات کے اعتراف میں سٹائین لکھتے ہیں
مجھے یہ کہنے میں بڑی مسرت ہو رہی ہے کہ رام چند بالی نے
۱۹۱۸ء کے موسم بہار سے بڑی گراں قدر خدمات انجام دیں۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

گذشتہ چھ برسوں میں وہ مسلسل طور پر میری تیسری وسط ایشیائی مہم کے
نتائج کی ترتیب کے سلسلے میں مصروف رہے اور اس کے ساتھ ساتھ کیٹلاگ
کی ترتیب اور اس مہم سے حاصل کئے ہوئے زمانہ قدیم کے آثار جو میں
سرینگر لایا ہوں، کی ترتیب میں انہوں نے میری مدد کی۔
میں نے رام چندر کو بہت محنتی اور معتبر مددگار پایا ہے ہم چاہے کیمپ
میں ہوں یا سردیوں کے دوران سرینگر یا دلی میں ہوں وہ ہمیشہ
دفتری اوقات کے بعد کام کرتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ
مسلسل طور پر میرے ساتھ بڑے اونچے پہاڑوں اور سطح ہائے مرتفع
پر بڑے خراب موسمی حالات میں رہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہیں
کام کرنے کی کس قدر زبردست لگن ہے"۔

آرل سٹائین
۲۹ر مئی ۱۹۲۴ء

رام چندر بلی ۱۹۱۷ء سے ۱۹۳۸ء تک تقریباً اکیس سال سر سٹائین کے ساتھ رہے
اور ان کے ساتھ ہی برفانی پہاڑوں، گھنے جنگلوں اور دور دراز مقامات کی خاک چھانتے
رہے۔ آرل سٹائین کی اس بامقصد آوارہ گردی میں رام چندر کے علاوہ صرف ان کا نوکر علیا ساتھ
تھا جس نے اس قدر بھیانک مصائب کو جھیلا اور آثار قدیمہ کی چھان بین، جستجو اور
تلاش کے ان بڑے کارناموں کی انجام دہی میں بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔
سر سٹائین نے شروع میں رام چندر بلی کو ایک کلرک کی حیثیت سے بھرتی کر لیا
تھا۔ لبعد میں وہ ان کے معتمد خاص بن گئے تھے۔ وہ اُن کی ملازمت سے ۱۹۳۹ء میں
سبکدوش ہو گئے لیکن آخر وقت تک ان کے تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ثبوت سر سٹائین کی اس خواہش میں ملتا ہے جہاں انھوں نے اظہار کیا تھا کہ مرنے کے بعد رام چندر بالی کے ہاتھوں موہند مرگ میں دفن کیا جاؤں۔ مگر اے ولئے! سر سٹائین کا انتقال اکتوبر ۱۹۴۳ء میں کابل کے مقام پر ہوا۔ اور ان کی خواہش پوری نہ ہو سکی مگر اس کے بعد سر سٹائین کے دوستوں نے رام چندر بالی کے ساتھ رابطہ قائم رکھا اور یہ رام چندر ہی تھے جنہوں نے موہند مرگ کی ایک چٹان کے پاس ایک لوح کندہ کروائی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

سر آرل سٹائین ۱۸۸۸ء میں پہلی بار کشمیر آئے تھے۔ یہاں کی سیر و سیاحت کے دوران انھیں کلہن کی راج ترنگنی کو سنسکرت سے انگریزی میں منتقل کرنے کا خیال آیا۔ انھوں نے یہ کام سنبھالا اور ہزار طرح کی دشواریوں کے باوصف اپنی زبردست محنت اور سنسکرت کے کشمیری عالموں کی مدد سے یہ کارنامہ مکمل ہوا۔ اس کے بعد برس ہا برس تک سر سٹائین کا گرمائی مستقر کشمیر رہا اور وہ موہند مرگ کی نظر فریب فضاؤں اور برف پہاڑوں سے ڈھکی ہوئی خاموش تنہائیوں میں اپنی جہاں گردی کے علمی تجربے کاغذ پر اتارتے رہے۔ کشمیر کے بے شمار صحت بخش مقامات اور مرگ زاروں میں انہیں یہ جگہ سب سے زیادہ پسند تھی۔ ان کو یہ جگہ اس قدر بھا گئی کہ یہ ان کی زندگی کا ایک قیمتی جز بن گئی۔ حتیٰ کہ انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ موت کے بعد انھیں اسی جگہ دفن کیا جائے۔ ایک یوروپی عالم کی اس سرزمین کی خوشبو سے اس قدر والہانہ لگاؤ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ سر سٹائین کشمیر کے قدیم کلچر، علم اور ادب ہی کے رسیا نہیں تھے بلکہ یہاں کی فضاؤں اور یہاں کی زمین کے بھی بڑے عاشق تھے۔ راج ترنگنی کے ترجمے کے علاوہ سر سٹائین نے وسط ایشیا اور دوسرے مقامات کے آثار قدیمہ کی کھوج ... تنہائیوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سر سٹائین عام طور سے ہر سال گرمیوں کے چند مہینے یہیں گذارتے تھے اور اپنے تجربوں اور مشاہدوں کے جوہر پر غور و فکر کرتے تھے اور پھر ان نتائج کو قلم بند کرتے تھے۔ ایسی ہی کئی گرمیاں اور سردیاں رام چندر بالی نے سر سٹائین کے ساتھ گذاریں۔ زمانے کے گرم و سرد سے بے پروہ یہ کشمیری نوجوان ایک قابل اعتماد ساتھی اور دوست کی طرح ان عظیم کارناموں کی انجام دہی کے لئے کوشاں رہے۔ انہیں نہ برستی بارشوں کا ڈر تھا نہ سرحدی علاقوں میں قبایلی حملوں کی پروا۔ ارل سٹائین کی عرق ریزیوں کو ٹائپ کے حروف میں اُتارنا رام چندر بالی کا کام تھا۔

رام چندر بالی کے کاغذات میں سر سٹائین کے خطوط کا ایک نادر کلیکشن موجود ہے۔ یہ خطوط نجی نوعیت کے ہیں لیکن ان میں سے بعض خطوط سے آرل سٹائین کی سرگرمیوں اور ان کی کشمیر کی سرزمین سے دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ آرل سٹائین اپنی طویل اور پُر خطر یورپ اور وسط ایشیائی سیاحت کے دوران بار بار موہند مرگ کو لوٹنے اور اسے دیکھنے کی خواہش کرتے ہیں۔ کشمیر سے دلچسپی کے تعلق سے چند خطوط کے تراجم ملاحظہ ہوں :-

نیپلز (اٹلی)

۲۵ جنوری ۱۹۳۵ء

میرے پیارے رام چندر

آپ کا ۱۱ دسمبر کا خط دو ہفتہ قبل ملا جس سے مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ میں اس میں آپ کی تصویر دیکھ کر خوش ہوا شکریہ میں اس وقت براعظم یورپ کا سفر کر رہا ہوں۔ اس لئے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اس خوب صورت خطے میں قدیم آرٹ، آثار قدیمہ اور دل چسپ کھنڈرات کی بہتات ہے۔

آپ کے خط سے مجھے اپنے پرانے کشمیری عالم دوستوں میں سے پنڈت نیتانند کی علالت کا حال جانکر بہت دکھ ہوا میری خواہش ہے کہ میں جب مئی کے آخر میں کشمیر چلا آؤں تو انہیں صحتیاب دیکھ سکوں۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ موسم سرما میں جو سارے شمالی ہندوستان میں سرد ہوتا ہے آپ کے یہاں اسقدر برف باری ہو کہ بہتر آب رسانی سے آپکے یہاں بہتر فصلیں ہوں۔

خلوص کیش

آرل سٹائین

معرفت الیسٹ انڈیا یونائٹیڈ سروس کلب

لندن - ایس ڈبلیو

۱۷ مارچ ۱۹۳۹ء

میرے پیارے رام چند

براہ کرم پنڈت نیتانند سے بہت جلد ملئے اور ان سے معلوم کیجئے کہ کیا انہیں وہ رقم ملی ہے جس کا میں نے اکتوبر اور اب جنوری میں ان کیلئے انتظام کروالیا ہے۔ یہ انہیں امپیریل بنک کے ذریعے ملے گی۔ یہ رقم دراصل نہیں "ڈان کویک زٹ" کے کشمیری اور سنسکرت ترجمے کے معاوضے کے طور پر دی گئی ہے۔ میں نے سنسکرت ترجمے کو صاف

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کرنے کیلئے پنڈت زاڈو کے ساتھ خط وکتابت کی تھی۔ کیا انہوں نے اس خط وکتابت کو ایک نظر دیکھ لیا ہے؟

مجھے بڑی مسرت ہوگی اگر پنڈت نیتانند مجھے کسی عالم پنڈت کا نام تجویز کرسکیں جو ایک دلنشین عالم کو نیل مت پران میں درج رسم ورواج کے بارے میں معلومات فراہم کرسکیں۔

خلوص کیش
آرل سٹائین

۲۲ منناہ پلیس
آکسفورڈ
۷-۱۱-۹-۱۹۳۹ء

میرے پیارے رام چندر

آپ کا ۱۶ اپریل کا خط مجھے گذشتہ ماہ اس وقت موصول ہوا جب میں "ٹرانس جورڈن کے ریگستانوں میں تحقیق، کھوج" کے کام میں مصروف رہا تھا۔ میں موسم گرما گذارنے کیلئے انگلستان واپس آگیا ہوں اور جو نتائج میرے طویل سفر سے حاصل ہوئے ہیں ان سے میرے دونوں ہاتھ بھرے ہوتے ہیں۔

میں اب بالکل بخیریت ہوں اور ریگستانی علاقوں میں اپنے مشکل کام سے محفوظ رہا ہوں۔ لیکن اب میرے سامنے ایک مشکل وقت آرہا ہے اس لئے انگلستان سے میرے خطی تو قع عبث ہے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

مجھے توقع ہے اگر سب کچھ درست رہا اور کشمیر دوسری بہار میں آسکا تو مجھے آپ سے مل کر بے انتہا خوشی ہوگی۔

خلوص کیش
آرل سٹائین

معرفت پوسٹ ماسٹر سرینگر

۱۸-۱۲-۱۹۳۹ء

میرے پیارے رام چند بالی

۳۰ر نومبر کے خط کیلئے آپ کا بے حد شکریہ! یہ خط مجھے سرینگر سے واپسی پر راستے میں ملا۔ آپ سے اچھی خبر پاکر مجھے بے حد خوشی حاصل ہوئی۔ اس سے پہلے مجھے آپ کا کوئی خط نہیں ملا۔ میں انگلستان میں تھا۔ جہاں عراق اور ٹرانس جورڈن میں پانچ ماہ کام ختم کرکے اب فراغت نصیب ہوئی ہے۔

میں سرینگر میں تقریباً دو ہفتے قیام کے بعد شمالی مغربی سرحد کی سیاحت کرنا چاہتا ہوں مئی کے مہینے میں واپس جا رہا ہوں اور دوسرے سال گرمیوں میں موہند مرگ میں کام مکمل کروں گا۔ میں بخیریت ہوں اور انگلستان سے باہر بھی بہت خوش گوار وقت گذارا ہے۔

آپ کی صحت اور ترقی کا متمنی
آپ کا
آرل سٹائین

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کیمپ معرفت پوسٹ ماسٹر سری نگر
۱۳ نومبر ۱۹۴۰ء

پیارے رام چند

میں وادی کشمیر میں اپنی سیاحت مکمل کر رہا ہوں میرا مقصد قدیم مقامات (SITES) اور کھنڈرات کی تصویریں حاصل کرنا تھا تاکہ انہیں راج ترنگنی کے نئے ایڈیشن کے ترجمے میں شامل کر سکوں اس لئے ان تمام قدیم مقامات کی دوبارہ سیاحت کی جہاں گھومنے کی سعادت مجھے ۵۲ سال قبل نصیب ہوئی تھی۔ یہ سیاحت میرے لئے انتہائی دلچسپی کا باعث ثابت ہوئی۔

خلوص کیش
آرل سٹائین

معرفت پوسٹ ماسٹر بہاول پور
۱۰ جنوری ۱۹۴۳ء

پیارے رام چند

۲۴ دسمبر کے آپکے خط کیلئے بے حد شکریہ یہ خط مجھے دو دن قبل ملا اور میرے لئے نیک خواہشات کا پیغام لے آیا یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ معہ اپنے اہل خاندان کے بخیریت ہیں اگرچہ آپ عارضی طور پر ان سے علیحدہ ہیں۔

میں خود یہاں جنوری کے پہلے ہفتے میں بحفاظت پہنچا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اور تب سے اس صحرا سے کافی نیچے سندھ کی حدود تک قدیم مقامات
کے "جائزے" میں مصروف ہوں،

ریاست بہاولپور کے ارباب اختیار اس کام میں میری
موثر امداد کر رہے ہیں۔ یہاں کے حکمران نے مجھے ایک عمدہ موٹر کار
سے نوازا ہے۔ میں بڑے آرام اور تیز رفتاری سے کافی کام
کرنے کے قابل ہوا ہوں حتیٰ کہ ریت کے بڑے بڑے ٹیلوں
میں بھی کام کر رہا ہوں جو اکثر اس سارے خطے کو چھپا دیتے ہیں۔

میں چند دنوں میں براستہ کراچی "لیس بیلا" کی حدود کے اندر
چلا جانا چاہتا ہوں جو "مکاران" کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ یہاں
سردیوں کے باعث غیر معمولی بارش ہو رہی ہے۔ جو خشک زمین
کیلئے مفید ہے۔ اگر حالات سازگار رہے تو میں اپریل کے اوائل میں
کشمیر آنا چاہوں گا۔

مجھے پنڈت نیتانند کے سورگباش ہونے سے بے حد
افسوس ہوا۔[۸]

آپ کی خیریت اور خوشحالی کا متمنی

خیر اندیش
آرل سٹائین

اسی سال سر سٹائین کا انتقال ۲۶ راکتوبر ۱۹۴۳ء کو کابل میں ہوا۔ جب
وہ کئی مہینوں سے افغانستان کے دور دراز علاقوں میں گھوم رہے تھے اور اپنی دلچسپی
کے کام میں ہمہ تن مصروف تھے۔ انتقال کے وقت آرل سٹائین کی عمر اکاسی برس کی تھی
اور اس طرح سے اس سرزمین کیساتھ جسکی روح کیساتھ انہیں والہانہ پیار رہا نصف

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

صدی پر پھیلے ہوئے تعلقات ختم ہو گئے۔ سٹائین ایک غیر ملکی عالم اور ماہر آثار قدیمہ ہونے کے علاوہ کشمیر کے ایک بڑے عاشق تھے۔ اس کا بین ثبوت بلج ترنگنی کا شہرہ آفاق ترجمہ ہے جو اُن کے قلم سے ہوا جس نے کلہن کو ہندوستان اور ساری دنیا میں پہنچا دیا۔ علم و فضل اور قدرت کے لازوال حُسن کا یہ مجنوں ہر سال کشمیر آیا اور موہند مرگ کے خوبصورت سناٹوں میں اپنے تجربات اور جگر کاویوں کو الفاظ کے سینے میں اتارتا رہا تاکہ آنے والی نسلیں ان سے فیض یاب ہوں۔

سر سٹائین اور رام چندر بالی کے تعلقات کا اندازہ سٹائین کے دوست ٹریڈ ہینڈرسن انڈر ویئر کے خطوط سے ہوتا ہے جو سٹائین کے انتقال کے بعد اینڈر ویئر نے رام چندر بالی کو لکھے تھے۔ اور جنہیں آر ل سٹائین کو اس آخری خواہش کا ذکر کیا گیا ہے جسکے مطابق وہ چاہتے تھے کہ انہیں موہند مرگ کی معصوم اور پاک اور شتیل ہوا دل کے آنچل میں دفن کیا جائے لیکن یہ ناممکن تھا۔ رام چند بالی نے اپنی تمام مشکلات کے باوجود اپنے عظیم دوست اور کشمیر کے اس عاشق کی یادوں کا احترام کرتے ہوئے ایک کتبہ کندہ کروایا جو برس ہا برس کی برفیلی ہواؤں کی تیز و تند آندھی اور دھول کے جھکڑوں کے باوجود آج تک وہاں موجود ہے۔

اینڈر ویئر کے یہ خطوط خطوں کے اس نادر کلکشن میں اب تک موجود ہیں۔

دو خطوں کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

۲۳ سیڈنیم مل لندن

۱۴ اپریل ۱۹۴۷ء

پیارے پنڈت رام چند بالی

کتنی برسوں سے مجھے آپ کے بارے میں کوئی خبر نہیں۔ میں آپ کے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بارے میں سوچتا رہا ہوں کہ آپ کیا کرتے رہے ہوں گے؟ اب یہ خط اس امید پر لکھ رہا ہوں کہ یہ خط آپکو کھوج نکالے گا۔ آپ کو لکھنے کی فوری وجہ یہ ہے کہ ایک معاملے میں آپکی امداد کا طالب ہوں یہ معاملہ ہمارے مشترکہ دوست مرحوم سر آرل سٹائین کی یادوں سے متعلق ہے۔

ان کی وراثت کے تعمیل کنندگان چاہتے ہیں کہ موہنمرگ پر ایک کتبہ لگوایا جائے جس پر سر سٹائین کی محبوب کیمپنگ مرگ کا ذکر کیا جائے۔ تجویز یہ کیا جاتا ہے کہ ایک مناسب چٹان پر یہ کتبہ کندہ کروا دیا جائے اور اس میں ان حقائق کا ذکر ہو۔ اس سلسلے میں پہلا کام ایک مستری کی تلاش ہے جو چٹان پر الفاظ کو تراش سکے اور جو اس مرگ پر جانے کیلئے رضامند ہو۔ آپ کشمیر میں تنہا آدمی ہیں جو اس مرگ میں اچھی طرح اس جگہ سے واقف ہیں اور صرف آپ ہی صحیح جگہ کی نشان دہی کر سکتے ہیں۔ جہاں مناسب چٹان پر اس کتبے کو تراشا جا سکتا ہے۔ آپکو یاد ہوگا مرگ میں ایک ایسی جگہ موجود تھی جسے سر آرل سٹائین ہمیشہ اپنی قبر کہا کرتے تھے اور جہاں ان کی خواہش تھی کہ انہیں دفن کیا جائے لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا کیونکہ آرل سٹائین کا انتقال کابل میں ہوا۔ اگر آپ اس مخصوص چٹان کو پہچان سکتے ہوں اور اگر اس پر الفاظ کو تراشنے کے لئے مناسب جگہ ہے تو یہ نہایت ہی مناسب ہوگا۔ اور اگر مناسب جگہ نہ ہو تو کسی نزدیکی چٹان کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کیا آپ، جب وہ وقت آئے، براہ کرم مستری کو اوپر او نچائی پر لے جاسکتے ہیں اور اسے مناسب جگہ دکھا سکتے ہیں کتبے کے الفاظ کو پورے سائز کے کاغذ پر نبوا رہا ہوں اور آپ کو یا اس شخص کو جس کا نام آپ بتائیں گے بھجوا دوں گا۔ آپ سے یہ معلوم کر کے کہ آپ اس کام میں ہماری امداد کر سکتے ہیں۔ سر سٹائین کے تعمیل کنندگان آپکو خرچہ ادا کریں گے۔

مجھے یقین ہے کہ آرل سٹائین کی یادوں کا احترام کرتے ہوئے آپ یہ کام بخوشی انجام دیں گے۔

میں اس معاملے میں آپ کی رائے کا منتظر رہوں گا۔ جواب ہوائی ڈاک سے جلد بھجوا دیں

آپ کی خیریت کا متمنی
نیک خواہشات کیساتھ
خلوص کیش
ٹریڈ ہنڈرسن انڈرویز

۲۴ رسینڈ رہم ہل لندن ایس۔ ڈبلیو۔ ۲۰۔ ،
۷ رمئی ۱۹۴۷ء

پیارے رام چند!

یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ کتبہ جسکی ایک نقل میں منسلک کر رہا ہوں ۱۸"×۲۴" کے سائز میں ہو تاکہ ایک مناسب پتھر پر سما سکے اور اس کے تراشنے میں زیادہ وقت صرف نہ ہو۔ میں نے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

مناسب وقت پر آپ کو سروے کی ڈرائنگ مستری کی رہنمائی کے لئے بھیج دوں گا۔ ان کی ہو بہو نقل ہونی چاہئے۔ اس سے پہلے مجھے اخراجات کا مکمل تخمینا معلوم ہونا چاہئے تا کہ میں اسے ان کے تعمیل کنندگان کے سامنے رکھ سکوں۔ جب کام مکمل ہو اس کی تصویر کھینچ کر نقل مجھے بھجوا دیجئے تا کہ میں ان کے سامنے پیش کر سکوں۔

میں آپ کی اس رائے سے متفق ہوں کہ چٹان محفوظ اور ڈھکی ہوئی جگہ پر ہو۔ اور اسے تقریباً" دو انچ گہرائی میں کندہ کیا جائے چونکہ وہ مخصوص مقام جو سر آرل سٹائین نے اپنی قبر کے لئے منتخب کیا تھا کھوجا نہیں جا سکتا[1] میں آپ کی اس رائے سے متفق ہوں کہ ایک مناسب چٹان جو ان کے کیمپنگ گراونڈ کے قریب ہو، انتخاب کیا جانا چاہئے۔ یہ فیصلہ آپ پر منحصر ہے۔

آپ نے ملاحظہ کیا ہو گا کہ میں آپ کی امداد کی پیش کش سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ آپ کو اس بات سے خوشی اور اطمینان ہو گا کہ اس مرگ کے ساتھ ہم اپنے محبوب دوست کی وابستگی کی یادوں کو تازہ کریں۔ اس مرگ میں جہاں ہم نے نہایت

---

[1] رام چندر بالی کے صاحبزادے اور میرے مخلص دوست سوم ناتھ بالی پرکاش راوی ہیں:-
موہند مرگ کے مرگ زار کے بیچوں بیچ ایک خوبصورت چشمہ ہے جہاں خودرو پھولوں سے گھری ہوئی ایک چٹان ہے جس پر برس ہا برس کی جغرافیائی تبدیلیوں نے لاتعداد شگاف پڑ چکے تھے اور کائی کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس لئے اس چٹان پر ارل سٹائین کا یہ کتبہ کندا کروانا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ بنا بریں ... سے سنگ مرمر کی ایک سل منگوائی گئی جس پر کشمیر کے فنکاروں نے الفاظ تراش لئے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri.

ہی حسین ماحول میں ان کے کیمپ میں بیٹھ کر بڑی شادمانیوں کے ساتھ
ان کی محبت کے مزے لوٹے تھے۔

خلوص کیش

ٹریڈ ہنڈرسن انڈرویز

سر آرل سٹائین نے کئی بار موہند مرگ کے مرغ ہونے والے سنالوٹوں میں ایک مخصوص
ہٹیان کے سایہ میں مرگ کی خوشبودار مٹی میں جذب ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔
اپنی روح کے نہاں خانوں میں چھپی ہوئی اس تمنا کا ذکر انھوں نے رام چندر بالی سے بھی کئی
بار کیا تھا۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔ موت کے آہنی ہاتھوں نے سر سٹائین کی اس
تمنا کی آسودگی کے مواقع چھین لئے اور اکاسی برس کی عمر میں افغانستان کی سیاحت کے دوران
کابل کے مقام پر ان کی اس تمنا کا گلا گھونٹ لیا۔
اس وقت رام چند بالی ان کے ساتھ نہیں تھے!
لیکن پھر سر سٹائین کی آخری خواہش کا احترام کرتے ہوئے رام چندر بالی ہی کے ہاتھوں یہ
کتبہ موہند مرگ میں کندہ کروایا گیا:۔

موہند مرگ

سر آرل سٹائین نے ۱۸۹۵ء کے موسم گرما جب کہ وہ راج ترنگنی کی
تالیف کر رہے تھے۔ اس مرگ میں پہلی بار اپنا کیمپ لگایا۔ بعد ازاں
جب وہ اپنے سفر ہائے عظیم کا حال لکھ رہے تھے کئی بار موسم گرما میں
پھر یہاں آئے۔ ستمبر ۱۹۴۳ء میں یہاں سے افغانستان روانہ ہوئے
اکاسی سال کی عمر میں بمقام کابل ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو رحلت کر گئے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اس طرح سے کشمیر کے شاداب حسن اور سدا بہار کلچر کے ایک عظیم آوارہ گرد عالم شیدائی کی کارگزاریاں اختتام کو پہنچیں۔ موہند مرگ کی تنہائیوں میں اس پراسرار پٹھان میں ضرور کوئی ایسی لازوال کشش رہی ہوگی جس کو دیکھ کر آرل سٹائین کی آنکھوں میں ایک ان بوجھی روشنی چمکنے لگتی تھی اور وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے والہانہ انداز میں کہتے تھے — "یہ میری قبر ہے"

اس راز کو ہم کیا جانیں!! ۔ یہ راز آرل سٹائین کے سینے میں دفن تھا یا ان کے دوستوں میں سے ہنڈرسن انڈویر، رام چند بالی یا پھر ان کے خانساماں علیا کو معلوم تھا۔ لیکن وقت کی آندھی ان کو بھی موت کی باہوں میں پہنچا گئی۔

یہ پراسرار راز اب کسی کو معلوم نہیں ہوگا!

آنے والا زمانہ صرف سر سٹائین کے کارناموں کو یاد کرے گا۔ اس عاشق کو فراموش کرے گا جس نے کشمیر کے سارے حسن کو موہند مرگ کے پراسرار سناٹوں میں سمیٹ لیا تھا اور اپنے ان بوجھے سوالوں کو مشکبار کردیا تھا۔

رام چند بالی ایک عالم اور ماہر آثار قدیمہ نہ سہی۔ لیکن کشمیر کے اس سچے عاشق کے شانہ بشانہ کام کرتے ہوئے ان کے کارناموں کی انجام دہی میں جو کام انہوں نے کیا وہ بذات خود ایک کارنامے سے کیا کم ہے۔ آج رام چند بالی کو کوئی نہیں جانتا جن کے بارے میں سر سٹائین نے ایک بار لکھا تھا۔

"اس طویل عرصے میں جب وہ تن تنہا بڑے ہی مشکل اوقات میں میری مدد کرتے رہے میں نے انہیں ذہین، قابل اعتماد اور زبردست مددگار پایا۔"

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

لیکن حق بات تو یہ ہے کہ رام چند بالی کو یہ اولوالعزمی محض ان کے فرائض منصبی کے باعث ہی حاصل نہیں ہوئی تھی بلکہ آرل سٹائین کی طرح وہ بھی اپنی سرزمین کے بھیانے عاشق تھے اور اسی عشق نے ہی انہیں سر سٹائین کے قریب کر دیا تھا۔

●●

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

حرفِ جستجو

ڈاکٹر برج پریمی کے تنقیدی اور تحقیقی مقالات

" ان مقالوں کے مطالعے سے ایک بہتر سوچنے والے ناقد کی آمد کا پتہ چلتا ہے جو فن اور فن کار کے تعلق سے جستجو اور تحقیق کو بھی ضروری سمجھتا ہے اور تجزیاتی مطالعے کی اہمیت بھی جانتا ہے۔"

پروفیسر شکیل الرحمن

قیمت پچیس روپے

جدید اردو شاعری: چند مطالعے

ریاست جموں و کشمیر سے ابھرنے والی ایک نئی اور ہوش مند آواز ——

پریمی رومانی کے تنقیدی مقالات

" شاعری میں تجربے اور تجربے کی شاعری میں بنیادی فرق ہے۔ نئی شاعری ذاتی تجربوں کی شاعری ہے۔ پریمی رومانی ان رموز سے واقف ہیں اور اس لئے شعراء کے انتخاب نے انہیں رسوا نہیں کیا۔ ان کے تنقیدی مضامین میں ایک اندرونی وحدت ہے۔ جو بلاشبہ ان کے تنقیدی شعور کی شاہد ہے۔"

پروفیسر عالم خوندمیری

قیمت بیس روپے

تاریکیوں کے جھلسا دینے والے سایوں میں جب لمحے پگھلتے ہیں تب دل کا درد قلم کی نوک پر آجاتا ہے۔

" سپنوں کی شام "

ایسے ہی پگھلتے لمحات میں دل کے درد کا اظہار ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی کے قلم نے اس درد کو اپنے افسانوں میں سمیٹ لیا ہے۔

قیمت ۔ ۳۰ روپے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

منٹو فحش نگار تھا

منٹو گندہ ذہن تھا

منٹو گنجا فرشتہ تھا

منٹو نوری تھا نہ ناری

منٹو اردو کا سب سے بڑا معتوب افسانہ نگار تھا

منٹو شرابی، پاگل، سنکی، لطیفہ باز اور..... تھا

لیکن

منٹو اردو افسانے کی آبرو ہے

منٹو کے بعد کوئی دوسرا منٹو پیدا نہ ہوا

سعادت حسن منٹو

شخصیّت اور کارنامے

نامور افسانہ نگار اور ادیب ڈاکٹر برج پریمی کی

سال ہا سال کی کاوشوں کا نتیجہ۔

جس پر موصوف کو کشمیر یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی

ڈگری دی گئی۔

(زیرِ طبع)

(مرزا بیلی کیشنز حسن آباد سری نگر کی فخریہ پیش کش)

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دیپ پبلی کیشنز کی چند مطبوعات

- جدید اردو شاعری، چند مطالعے
- حرف جستجو
- جلوۂ صد رنگ
- چند تحریریں
- پریم ناتھ پردیسی — شخصیت اور فن
- مضامین
- اختر الایمان — شخصیت اور فن
- سیلنوں کی شام
- ریاست جموں و کشمیر میں اردو فکشن
- اردو زبان و ادب کی ترویج میں کشمیری پنڈتوں کا حصہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri